

قرآن مجید کی چند عربی تفسیریں

مطالعہ اور تعارف

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی



قرآن مجید کی چند عربی تفسیریں

مطالعہ اور تعارف

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

ملک اینک پیپر

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

16-9-2017
7
1592

نام کتاب : قرآن مجید کی چند عربی تفسیریں - مطالعہ اور تعارف
نام مؤلف : ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
اہتمام : ملک ساجد قادر
مارکیٹنگ مینیجر : ملک اسد علی قاسمی
مطبع : گنج شکر پرنٹرز
سن اشاعت : 2017
قیمت : 200 روپے

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ 54000

03214021415، 042-37248209

فہرست

v - vi	مقدمہ
01-09	سفیان ثوریؒ اور ان کی تفسیری خدمات
10-24	امام واحدیؒ اور ان کی تفسیری خدمات
25-67	شیخ محمد عبده کی تفسیری خدمات
68-101	تفسیر فی ظلال القرآن - ایک تجزیاتی مطالعہ

طوبہ مدینہ منورہ

۲۱۵/۲

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا
وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا
وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا
وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

مقدمہ

مسلمانوں کی ہدایت اور اصلاح کا بنیادی سرچشمہ قرآن مجید ہے اس لئے ابتداء سے مسلمانوں نے قرآن مجید کی خدمت اور اس کے فہم و تدبر کو اپنے لئے سرمایہ حیات سمجھا۔ خود آنحضرت قرآن مجید کی تبیین و تشریح کی خدمت پر مامور تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

”وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما انزل الیہم ولعلہم یتفکرون“ (النحل: ۴۴)

(اور ہم نے تمہاری جانب ذکر (قرآن مجید) کو اتارا ہے تاکہ تم اسے لوگوں سے

بیان کرو)

رسول اللہ نے قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کی جو تشریح و تفسیر کی یوں تو بیشتر صحابہ کرام نے آپ کے دیگر اقوال کی طرح انہیں محفوظ کیا اور دوسروں تک منتقل کیا لیکن قرآن مجید سے ذہنی مناسبت اور اس پر تدبر و تفکر کی صلاحیت اور قدرت کے باعث بعض صحابہ نے خاص طور سے اس میں حصہ لیا اور بے شمار تفسیری اقوال اپنے بعد کے لوگوں (تابعین عظام) تک پہنچانے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ ان صحابہ میں کم از کم دس ایسے ہیں جن سے بے شمار آیات قرآنی کی تفسیر و تاویل پر مبنی روایات موجود ہیں ان میں سے کئی ایک کو باضابطہ طور سے مفسر قرآن کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان حضرات کی تعلیم و تربیت سے تابعین عظام میں سے ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی۔ انہوں نے قرآن مجید کے سیکھنے اور سکھانے کا خاص اہتمام کیا اور علم تفسیر کو محفوظ رکھنے کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں۔ تفسیر کی تاریخ لکھنے والوں نے ایسے دو درجن تابعین کے اسماء گرامی کا تذکرہ کیا ہے۔ عہد تابعین کے بعد دیگر اسلامی علوم کی طرح علم تفسیر میں بھی مسلم علماء نے اپنی توجہ اور جانفشانی سے گراں قدر اور بیش بہا سرمایہ اور خزانہ اپنی یادگار چھوڑا۔ چنانچہ امت کی تاریخ کے ہر دور

اور ہر زمانے میں قرآن حکیم کی متعدد تفسیریں لکھی گئی ہیں جن میں سے بہت سی آج بھی متداول ہیں۔ اس سرمایہ کو دیکھ کر کوئی یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ تفسیر قرآن کا حق ادا ہو گیا ہے لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ دنیا میں کسی کتاب کی نہ اتنی شرحیں لکھی گئی ہیں، نہ اتنے ترجمے ہوئے ہیں اور نہ اس کے مختلف پہلوؤں کو اس قدر اجاگر اور نمایاں کیا گیا ہے۔

پیش نظر کتاب میں تفسیر کے اس عظیم الشان ذخیرہ میں سے چار تفاسیر اور ان کے مولفین پر گفتگو کی گئی ہے۔ مشہور تابعی سفیان ثوری (۹۷ھ-۱۶۱ھ)، امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیسابوری (۳۹۸ھ-۴۶۸ھ)، شیخ محمد عبده (۱۸۴۹ء-۱۹۰۵ء) اور سید قطب شہید (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء)۔ یہ دراصل چار مقالات ہیں جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں جن مفسرین یا تفاسیر کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے ان کے انتخاب میں کسی منصوبہ یا منطقی ترتیب کا دخل نہیں ہے اس لئے ان کے مابین باہم ربط و تعلق بھی نہیں ہے۔ تاہم یہ محض اتفاق ہے کہ یہ امت مسلمہ کی تاریخ کے تین بڑے ادوار کی نمائندہ تفاسیر ہیں۔ پہلی عہد تابعین، دوسری خلافت عباسیہ کے دور آخر اور تیسری اور چوتھی بیسویں صدی عیسوی کی یادگار اور ترجمان ہیں۔

یہ مقالات پہلے برصغیر کے معروف قرآنی مجلہ ”علوم القرآن“ علی گڑھ میں شائع ہوئے تھے۔ میں مجلہ کے مدیر اعلیٰ (محترم پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب) اور اس کے مدیر (محترم پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب) کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے ان تفاسیر کے مطالعہ و تجزیہ اور ان کا تعارف پیش کرنے کے لئے میری حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی اور پھر اس حقیر کاوش کو اپنے موقر مجلہ کے قیمتی صفحات میں شامل کیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہترین اجر عطا فرمائیں۔ آمین

صدر سلطان اصلاحی

۱۰ اپریل ۲۰۱۵ء

سفیان ثوریؒ

اور ان کی تفسیری خدمات

(حضرت سفیان ثوریؒ (۹۰-۱۶۱ھ) جلیل القدر تابعی، معروف فقیہ، محدث اور مفسر ہیں۔ فقہ نے عزم مولیٰ لگاؤ کی وجہ سے انھیں "فقیہ العرب" کا لقب دیا گیا۔ فقہ، حدیث اور دیگر علوم میں ان کی تصنیفی و تحقیقی خدمات سے سب ہی واقف ہیں۔ تفسیر کی کتابوں میں ان سے مروی روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کی تفسیری روایات کو ان کے ایک شاگرد نے یکجا مرتب کر دیا تھا جس کو تقریباً ایک مستقل تفسیر کی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر یاشم عبد یاسین المشہدانی نے اس تفسیر کی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنے ایم۔ اے۔ کے مقالہ کے لیے منتخب کیا۔ جس پر انھیں جامعہ ازہر کے کلیہ اصول الدین نے ایم۔ اے۔ کی ڈگری عطا کی۔ بعد میں یہ مقالہ عراق سے شائع ہو گیا۔ جو ۱۹۵۹ء میں پرنٹ ہو گیا ہے۔ اسی کی روشنی میں سفیان ثوریؒ اور ان کی تفسیری خدمات کا مختصر جائزہ ذیل کے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے)

سفیان بن سعید بن مسروق ثوریؒ کی پیدائش ۹۰ھ / ۱۵۱ء کو کوفہ میں ہوئی۔ ان کے والد سعید بن مسروق انتہائی قابل اعتماد اور مشہور محدث تھے اور والدہ کوفہ کی ایک متقی پرہیزگار اور صاحب فہم و فراست خاتون تھیں۔ خود کوفہ شہر شروع ہی سے صحابہؓ اور تابعین کی مخصوص توجہ کا مرکز رہا جس کی وجہ سے قرآن اور فقہ کے ممتاز علماء کا مستقر بن گیا تھا۔ سفیان ثوریؒ کے عہد کو اسلامی علوم و فنون کی نشوونما اور ارتقاء کا عہد کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے والدین کی رہنمائی میں کوفہ کی علمی و ادبی فضا سے کما حقہ استفادہ کیا۔ علم کی مزید تکمیل کے لیے انھوں نے

کہ، مدینہ، خراسان، شام اور بصرہ کا سفر کیا اور اپنے زمانے کے تقریباً تمام مشہور علماء سے براہ راست ملاقات کر کے سوالات، گفتگو اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ اپنی علمی پیاس کو بجھایا۔ کوفہ، بصرہ اور حجاز میں ان کے اساتذہ اور مشائخ کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تک پہنچتی ہے۔ پوری زندگی حصول علم میں سرگرداں رہے۔ جس کی وجہ سے جہاں انھوں نے سیکڑوں سے استفادہ کیا وہیں ہزاروں اور لاکھوں کو فائدہ پہنچایا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ناقابل شمار ہے۔

سفیان ثوریؒ کو بارگاہ ایزدی سے مخصوص صلاحیتیں اور خوبیاں ودیعت ہوئی تھیں۔ آپ کی شخصیت علم و ثقافت، جرأت و بے باکی، صبر و استقامت، زہد و ورع اور تقویٰ و خیر خواہی سے مرکب تھی۔ حق گوئی کی وجہ سے زندگی کا بہت بڑا حصہ جلا وطنی کی نذر ہو گیا۔ خلیفہ منصور اور مہدی کے ظلم و جور اور فضول خرچیوں پر انھوں نے کھلے عام تنقید کی اور کوئی لالچ یا دھمکی انھیں اعلا کلمۃ اللہ سے روک نہیں سکی۔ ذولوں خلفاء کی طرف سے انھیں متعدد بار عہدہ قضا کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن انھوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ خلیفہ وقت پر بے باکانہ تنقید اور عہدہ قضا کی قبولیت سے انکار کی وجہ سے انھیں بے پناہ مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تاہم ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ ان کے عزم و ارادہ کی پختگی، راہ خدا میں استقامت اور حق گوئی و بے باکی نے عوام و خواص ہر ایک کو متاثر کیا۔ ان کا انتقال بصرہ میں ۱۶۱ھ / ۷۷۸ء میں ہوا۔ ان کے انتقال پر کوفہ و بصرہ میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

تصانیف :

سفیان ثوریؒ قدیم مصنفین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ حدیث اور فقہ ان کے خاص موضوع تھے۔ تصنیف و تالیف اور مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کتب حدیث اور تفاسیر میں ان سے مروی روایتیں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم ماخذ اور کتابیات مصادر میں ان کی جن مستقل کتابوں کا ذکر ملتا ہے ان کی تعداد گرچہ بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے چند کے علاوہ بقیہ تمام حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ علمی ذخائر میں اب تک ان کی صرف نو کتابوں کا پتہ چل سکا ہے جن کے نام یہ ہیں :

- (۱) کتاب تفسیر القرآن (۲) کتاب الفرائض (۳) الاعتقاد (۴) ما سندہ سفیان الثوری۔
 (۵) رسالۃ فی الزہد (۶) وصیۃ الی علی بن الحسن السلمی (۷) الجامع الکبیر فی الفقه والاختلاف
 (۸) الجامع الصغیر (۹) کتاب آداب سفیان الثوری

تفسیر قرآن :

سفیان ثوری نے قرآن مجید کی کوئی باقاعدہ تفسیر نہیں لکھی البتہ ان کے تفسیری اقوال اور روایات کو ان کے ایک شاگرد ابو خذیفہ موسیٰ بن مسعود النہدی البصری نے بڑی محنت اور سلیقہ سے کتابی شکل میں یکجا کر دیا تھا۔ اس کی کتابت تیسری صدی ہجری میں کوفی رسم الخط میں کی گئی تھی۔ اس کے تمام نسخے تقریباً ضائع ہو گئے تھے صرف ایک نسخہ رضالائبریری (رام پور) میں محفوظ تھا۔ نسخہ شروع سے آخر تک انتہائی شکستہ اور ناقص تھا اور اس کے اوراق بڑی بوسیدہ حالت میں تھے۔ اس کی عبارت کا پڑھنا، صفحات کو مرتب کرنا، الفاظ کی تصحیح اور مختلف افراد مقامات و کتب کے ناموں کی تصحیح ایک مشکل کام تھا۔ اس کام کے لیے ایک محنتی اور نکتہ رس محقق کی ضرورت تھی۔ خدا نے اس جلیل القدر کام کی تکمیل کا شرف مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم کو عنایت فرمایا۔ مرحوم ایک عرصے تک رام پور کی لائبریری کے منتظم تھے ان کی شخصیت علمی و ادبی حلقوں میں بڑی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ انھوں نے مخطوطہ کی تدوین میں بڑی جانفشانی اور زور لگا ہی سے کام لیا اور اس متاع گمشدہ کو افادہ عامہ کے قابل بنا دیا۔

اس مخطوطہ میں ۳۹ سورتوں کی متعدد آیتوں پر سفیان ثوری کے ۱۱۹ تفسیری اقوال ہیں۔ اس کی اکثر روایتیں مرفوع یا منقطع یا موقوف ہیں جن میں بعض اقوال سفیان ثوری کے ہیں اور اکثر و بیشتر کی مفسرین سے مروی ہیں۔ تفسیری کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس تفسیر میں سفیان ثوری کے تمام تفسیری اقوال اور افکار کو نقل نہیں کیا جا سکا۔ حدیث، تفسیر، علوم القرآن، تاریخ، تراجم، تصوف اور لغت کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے اگر ان کے اقوال کو اکٹھا کیا جائے تو اس سے اس مخطوطہ پر ایک بیش بہا اضافہ ہوگا جس کے بعد

ثوری کی تفسیر ایک مکمل تفسیر ہو سکتی ہے یقیناً یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے حدیث اور تفسیر سے متعلق وسیع لٹریچر کا خاص طور سے استفعا کرنا ہوگا اور بحث و تحقیق کے مشکل مراحل سے گزرنا ہوگا۔ لیکن یہ کام یقیناً اس لائق ہے کہ اس کے لیے ایک ہفت خواں سر کی جائے۔

تفسیری ماخذ :

سفیان ثوری کے تفسیری ماخذ بہت زیادہ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ماثورات و منقولات پر اعتماد کے ساتھ ساتھ تدبر و تفکر اور اجتہاد و استنباط سے غفلت نہیں برتی۔ بلکہ وہ غور و خوض کو تفسیری کام کے لیے انتہائی ضروری قرار دیتے ہیں۔ جس طرح وہ اقوال صحابہ و تابعین کو نقل کرتے ہیں اسی طرح عربی زبان، عربی تاریخ، عربی قواعد و ضوابط اور غور و فکر سے بھی مدد لیتے ہیں۔ ان کے تفسیری ماخذ وہی ہیں جو اکثر و بیشتر قدیم مفسرین کے یہاں معروف ہیں یعنی قرآن مجید، حدیث، اقوال صحابہ و تابعین، لغت اور تدبر و استنباط۔

منہج تفسیر :

"تفسیر القرآن بالقرآن" علماء کے نزدیک متفقہ طور سے قرآن کی تفسیر کا بنیادی اصول ہے۔ قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعہ وہی شخص کر سکتا ہے جو قرآنی آیات کا بہترین علم رکھتا ہو اور ان کے معانی و مفہام کو سمجھتا ہو۔ سفیان ثوری نے تفسیر کے اس اصول کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے۔ وہ اپنی تفسیر میں ایک آیت کی تشریح اسی جیسی دوسری آیات سے اور ایک مفہوم کی وضاحت اسی جیسے دوسرے مفہوم سے پیش کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں ان کی تفسیر سے اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں بالخصوص وہ واقعات اور قصص کی تشریح و توضیح میں اس سے بڑی مدد لیتے ہیں۔ آخرت، جنت اور جہنم کے مناظر نیز دنیا کی بے ثباتی سے متعلق آیات کو وہ زیادہ تر قرآن ہی کی مدد سے واضح کرتے ہیں۔

قدیم مفسرین مختلف قراءتوں سے واقفیت کو قرآن کی تفسیر کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اختلاف قراءت سے ترجمہ و تفسیر قرآن میں خاصا فرق واقع

ہو جاتا ہے۔ ان قراروں سے واقفیت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مفسر بیک وقت کئی پہلوؤں پر غور کر سکتا ہے۔ سفیان ثوریؒ کی تفسیر کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ قرأت سبعہ سے واقف تھے اور اس سے انھوں نے اپنی تفسیر میں خاصا استفادہ کیا ہے۔ قرأت کے تعلق سے اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس سے قرآن کی تشریح و توضیح میں جتنا فائدہ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ اس سے نقصان ہوا ہے۔ بہت سے مقامات پر قرآن کے معانی کی وضاحت میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا معاملہ بھی کچھ کم اہم نہیں لیکن اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ اس اختلاف قرأت سے فائدہ اٹھا کر مستشرقین نے قرآن کے تحفظ کو (لغو ذبالہ) مشکوک اور مشتبہ قرار دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

سفیان ثوریؒ کو علوم قرآن پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ سورتوں کے شان نزول، زماذ نزول، ان کے اسما و فضائل، نظم قرآن، معرب و محکم نیز مشکل و متشابہ الفاظ آداب تلاوت، اسلوب قرآن، حروف مقطعات اور ناسخ و منسوخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تفسیر میں ان علوم سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی طرح وہ زبان و بیان، نحو صرف اور ادب و بلاغت کے مسائل و غیرہ پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ اسی باعث ان کی تفسیر میں الفاظ کی تشریح، کلمات پر بحث، جملوں میں ربط و تعلق اور اعراب کے اختلاف پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

حروف مقطعات کے متعلق سفیان ثوریؒ عام محدثین کی طرح یہ خیال رکھتے ہیں کہ یہ حروف قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے راز ہائے سرستہ ہیں جن پر گفتگو کرنے کو وہ ناپسند کرتا ہے اور ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس خیال کے باوجود انھوں نے بعض حروف کی تشریح کی بھی کوشش کی ہے مثلاً وہ کھنص کے معنی کبیر، ہادی، امین، عزیز اور صادق بتاتے ہیں اور ایسے سے یا محمد مراد لیتے ہیں۔

ثوریؒ نے آیات متشابہات اور محکمات کی وضاحت کی ہے۔ جن آیتوں کی تفسیر و توضیح ممکن ہوا نہیں وہ محکم سمجھتے ہیں اور جن کی تفسیر ممکن نہ ہو انہیں متشابہ قرار دیتے ہیں وہ آیات متشابہات پر گفتگو کو ناجائز اور ان پر ایمان کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے

سلک پر مختلف اہل علم، محدثین اور صحابہؓ و تابعینؓ کے اقوال سے استدلال کیا ہے۔ حروف مقطعات، صفات باری تعالیٰ، قیامت اور اس کے مناظر، خربج یا جوج و ماجوج، دجال اور عیسیٰ کا نزول وغیرہ سے متعلق آیات کو وہ متشابہ قرار دیتے ہیں۔

امام ثوریؒ نسخ کے وقوع کے قائل ہیں اور ناسخ و منسوخ کے متعلق علم حاصل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کی تفسیری روایات میں ناسخ و منسوخ سے متعلق متعدد جگہوں پر مباحث ملے ہیں۔ ان کے یہاں نسخ کے مفہوم میں منتقل کرنا، زائل کرنا، بھلانا اور محو کرنا شامل ہے۔ نسخ کے سلسلے میں ان کا موقف اعتدال اور میانہ روی پر مبنی ہے وہ کسی مضبوط دلیل یا قرینے کے بغیر نسخ کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ ایک طرف جہاں انھوں نے بہت سی آیتوں کے منسوخ ہونے کو تسلیم کیا ہے تو دوسری طرف بہت سی آیتوں کے بارے میں یہ وضاحت کی ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہیں حالانکہ بعض دوسرے علماء انھیں منسوخ مانتے ہیں۔

امام ثوریؒ نے اپنی تفسیر میں ماثورات و منقولات پر اعتماد کے ساتھ ساتھ عقل و فہم اور قوت اخذ و استنباط کو بھی استعمال کیا ہے۔ سلفی مفسر ہونے کی وجہ سے یقیناً انھوں نے ماثورات و منقولات کو عقل و فکر پر ترجیح دی ہے لیکن پھر بھی اجتہاد و استنباط اور غور و فکر کو بالکل نظر انداز نہیں کیا۔ خود ماثورات کی بحث و تحقیق میں انھوں نے روایت اور درایت کے تمام اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان سے مروی تفسیری روایات کو عام طور سے صحیح قرار دیا گیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ثوریؒ کی تفسیر بالرائے اصول و ضوابط کی پابند ہے اور ان سے کہیں بھی زیادتی یا تجاوز سرزد نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے تفسیر بالرائے کے لیے قرآن و حدیث پر گہری نظر، عربی زبان و ادب سے واقفیت اور دینی فہم و فراست کو ضروری قرار دیا ہے۔

عقیدے سے متعلق آیتوں کی تفسیر میں ثوریؒ نے سلفی مسلک اختیار کیا ہے وہ عقیدے کے اعتبار سے علماء اہل سنت و الجماعت کے ساتھ ہیں۔ ثوریؒ نے اپنی تفسیر میں عقیدے کے جن اہم مباحث سے تعرض کیا ہے ان میں صفات باری تعالیٰ کا مسدس فرہست ہے اس مسدس میں علماء کے اختلافات کافی مشہور ہیں۔ ثوریؒ صفات باری تعالیٰ سے متعلق آیات کو آیات

مشابہات میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح روایتِ باری تعالیٰ، مسئلہ خلق قرآنی، عذاب قبر اور معراج سے متعلق مباحث میں انہوں نے اسلاف کے مسلک کی پرزور تائید کی ہے۔ البتہ مسئلہ جبر و قدر میں انہوں نے اسلاف سے اختلاف کرتے ہوئے اعتدال اور میاندروی کی راہ اختیار کی ہے۔ ان کا مسلک جبریہ اور قدریہ کے متشدد نظریات کے بین بین ہے۔

سفیان ثوریؒ فقہ کے ایک مشہور امام ہیں۔ ان کے فقہی افکار کو علماء کے یہاں منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کا مسلک فقہ ایک مستقل مسلک مانا جاتا ہے۔ فقہ سے غیر معمولی لگاؤ اور اس پر مکمل قدرت کی وجہ سے انہیں فقیہ العرب کہا گیا ہے۔ فقہ میں ان کی چند مستقل تصانیف بھی ہیں۔ ان تصنیفات کے علاوہ ان کے فقہی اقوال فقہ کی تمام متداول کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ثبوت، استنباط، وسعت اور اقوال و ظروف سے واقفیت کی وجہ سے ان کے فقہی اقوال تمام مسالک فقہ میں یکساں اہمیت کے حامل سمجھے گئے ہیں۔ قرآنی آیات کی فقہی تفسیر میں ان کے اقوال بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ تفسیر کی کتابوں میں ان کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

کلام الہی کی تفسیر میں عربی زبان و ادب سے واقفیت کا بڑا دخل ہے۔ سفیان ثوریؒ عربی زبان کے تمام مسائل، رموز و اشارات اور اصول و ضوابط سے آگاہ تھے اسی وجہ سے اپنی تفسیر میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں تعقید، غموض، ابہام اور بے جا مبالغہ آرائی سے احتراز کیا ہے۔ ان کی تفسیر میں اختصار اور باریک بینی کا جگہ جگہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کلمات کے اندر مخفی معانی و انکار کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے اور عربی زبان کے مسائل پر غور و فکر کر کے الفاظ کے انتہائی خوبصورت اور بر محل معانی کی تلاش کی ہے۔ انہوں نے کبھی کبھی تفسیر میں معانی کی وضاحت کے لیے ہاتھوں اور انگلیوں کی مختلف حرکات و سکنات پر اعتماد کیا ہے۔ اس عملی تفسیر سے ان کا مقصد یہ ہے کہ معانی مکمل طور پر واضح ہو جائیں اور ذہن میں ان کا نقشہ سا کھینچ جائے۔

سفیان ثوریؒ اپنے دور کے بعض دوسرے اہل علم کی طرح اسرائیلیات کی مفسرتوں سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اسی لیے وہ ان کو قبول اور نقل کرنے میں کافی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں سے مروی تفسیری روایات کی قبولیت کے لیے بڑے

سنت اور مضبوط اصول و قواعد وضع کیے اور تمام روایات کی پوری تحقیق و تفتیش کی۔ اس طرح وہ خود ساختہ اور بے بنیاد تفسیری روایات کے ایک بڑے حصے کو اپنی تفسیر سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود بعض روایات کے سلسلے میں ان سے چونک ہو گئی اور انہوں نے کچھ ایسی اسرائیلی روایات کو بھی اپنی تفسیر میں نفل کر دیا ہے جو قرآن و حدیث کے مزاج سے میل نہیں کھاتیں۔

علمی خدمات اور اثرات:

سفیان ثوریؒ کی تفسیری خدمات بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے شاگردوں کی ایک ایسی ٹیم تیار کر دی جس نے قرآن مجید کی خدمت میں بڑا حصہ لیا اور امام ثوریؒ کی تفسیری روایتوں کو نقل کیا۔ اسی طرح ان کی تصانیف کو بھی قرآن مجید کی تشریح و تفسیر میں بڑی اہمیت حاصل ہے انہوں نے علم تفسیر اور دیگر علوم پر غور و فکر کرنے کا جو دقیق بیج اختیار کیا اس سے بعد میں آنے والوں کو قرآن فہمی کے اصول و ضوابط اخذ کرنے میں بڑی مدد ملی۔

امام ثوریؒ نے جن لوگوں سے روایت کی ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں چند ایسے بھی ہیں جن سے انہوں نے خصوصی استفادہ کیا ہے جبکہ دوسرے مفسرین اور محدثین نے ان کو اس توجہ کا مستحق نہیں سمجھا۔ اس طرح ان کے ذریعہ ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ ہم تک منتقل ہو سکا۔ انہوں نے بعض غیر ثقہ افراد سے بھی روایت کی ہے استفادہ اور روایت کا یہ عمل روایت اور درایت کے مضبوط اصولوں پر مبنی تھا جس کی تفصیل انہوں نے بیان کر دی ہے۔ بعد میں مفسرین اور محدثین نے ان کی روایات کو صحیح قرار دیا ہے۔

روایتوں کی سماعت اور قبولیت میں ثوریؒ نے جو طریقہ اختیار کیا تھا اسے بلاشبہ ایک سائنٹفک اور علمی طریقہ کہا جاسکتا ہے انہوں نے اسناد کا جرح و تعدیل کے اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا۔ اکثر و بیشتر وہ روایات کو سنتے ہی لکھ لیا کرتے تھے۔ وہ کسی کتاب سے سماعت اور قراءت کو زبانی سماعت و قراءت پر ترجیح دیتے تھے۔

سفیان ثوریؒ کے بعد ان کے تفسیری اقوال اور روایات کو مفسرین نے جس طرح اعتماد کے ساتھ نقل کیا اس سے ان کی علمی صلاحیت اور برتری کا مکمل اعتراف ہوتا ہے۔ تفسیر کی کتابیں

ان کے اقوال سے بھری پڑی ہیں۔ بلاشبہ مفسرین کی ایک بڑی تعداد سفیان ثوریؒ سے متاثر ہوئی ہے جن میں امام طبریؒ، عبدالرزاقؒ، ابن ابی حاتمؒ، قرطبیؒ، سیوطیؒ، ابن جوزیؒ اور ابن عطیہؒ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

مفسرین کی طرح علماء حدیث اور علماء فقہ بھی ان سے متاثر اور مستفید ہوئے ہیں۔ محدثین میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور ابن ماجہؒ وغیرہ اور فقہاء میں ابن رشدؒ، ابن خزمؒ اور ابن قدامہؒ وغیرہ نے ان سے بہت سی احادیث اور فقہی افکار و خیالات کو نقل کیا ہے۔ اسی طرح تصوف، سیرت، ترجمہ اور تاریخ وغیرہ کی کتابوں میں بھی ان سے استفادہ کیا گیا ہے۔ امام نعیمؒ، ابن ابی حاتمؒ اور بلاذریؒ وغیرہ کی تصانیف اس کی بہترین مثال ہیں۔

امام واحدی اور ان کی تفسیری خدمات

امام واحدی پانچویں صدی ہجری کے مشہور مفسر قرآن گزرے ہیں۔ ان کی تفسیر میں علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ معاصر مفسرین میں ان کا مقام بہت نمایاں ہے اور بعد کے مفسرین پر بھی ان کے براہ راست اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن ان کے علمی مقام و مرتبہ اور تفسیری خدمات و تحقیقات سے عموماً لوگ کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ یہ کمی ڈاکٹر جودہ محمد ابو زید المہدی انقشبندی نے پوری کی۔ ڈاکٹر موصوف کا تعلق مصر کے ایک صوفی خاندان سے ہے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم جامعہ ازہر سے حاصل کی اور تفسیر و حدیث ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ انھوں نے تفسیر اور علوم تفسیر پر ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پیش نظر مقالہ ان کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔ وہ مصر کی مختلف جامعات میں تدریسی خدمات بھی انجام دے چکے ہیں۔ تصوف اور صوفیاء پر ان کی کئی تالیفات ہیں۔ یہ مقالہ کل ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے مصری وزارت اوقاف نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ مقالے کی زبان اور انداز بے حد علمی اور تحقیقی ہے۔ افادہ عام کی غرض سے اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سوانحی خاکہ :

امام واحدی کا تعلق خراسان کے مشہور شہر "ساده" سے تھا۔ یہ شہر ری اور حمدان کے درمیان واقع تھا۔ آباؤ اجداد کے تجارتی پیشہ ہونے کا وجہ سے مالی طور سے خوشحال تھے۔ یہ خوشحالی ان کی علمی سرگرمیوں کے لیے معاون ثابت ہوئی۔ ان کے خاندان کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ خاندان بعد میں نیشاپور منتقل ہو گیا اور امام واحدی کی پوری زندگی نیشاپور ہی میں بسر ہوئی۔ فقہی مسلک

کے لحاظ سے وہ شافعی تھے۔

ان کا پورا نام ابو الحسن علی بن احمد بن محمد بن علی بن متویر الواحی النیساپوری تھا۔ دستیاب قرآن کی روشنی میں ان کی پیدائش ۳۹۸ھ میں ہوئی اور وفات ۴۶۸ھ میں۔ نیساپور کی علمی و ادبی فضا ان کی تعلیم و تعلم کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے ہوا جس کے دوران انھیں لکھنے، پڑھنے اور ادب و شعر گوئی میں دلچسپی لینے کا موقع بھی ملا۔ اس ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ نیساپور کے مشہور مدرسہ حدیث "دار السنۃ" سے وابستہ ہو گئے اور وقت کے جلیل القدر محدثین سے استفادہ کیا۔ پھر فقہ، کلام، لغت اور ادب و غیرہ کی مزید تحصیل کے لیے انھیں نیساپور اور اس کے باہر عالم اسلام کے مختلف علمی مراکز کا سفر کرنا پڑا۔ انہوں نے بے شمار اساتذہ علم و فن سے فیض حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد انھوں نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ براہ راست اور بالواسطہ طور سے ان کے تلامذہ اور مستفیدین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے بعض کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

امام واحی کا زمانہ سیاسی عدم استحکام اور انتشار کا زمانہ تھا۔ خلافت عباسیہ کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ عالم اسلام چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ مرکزی خلافت کے دعوے کے درمیان بھی حصول اقتدار کے لیے شدید کشمکش جاری تھی۔ اس تکلیف دہ صورت حال کے باوجود امام واحی کی ریختوس نصیبی تھی کہ انھیں اپنے وقت کی دو مضبوط و مستحکم اور علم دوست و علم پرور حکومتوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ خاندان غزنوی اور سلجوقی کی یہ دونوں حکومتیں، عالم اسلام کی دیگر حکومتوں کے مابین جاری کشمکش میں، علم و فن کی سرپرستی میں بھی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جس کے براہ راست فائزے علماء و فضلاء اور فلاسفہ و متکلمین کو حاصل ہوئے۔ اس کے طفیل علمی ترقیوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کتب خانوں اور لائبریریوں کی شکل میں بے شمار علمی مراکز قائم ہوئے۔ بالخصوص مشہور سلجوقی وزیر نظام الملک حسن بن علی طوسی کی زیر پرستی بغداد کی مشہورہ آفاق دانش گاہ مدرسہ نظامیہ کی تاسیس عمل میں آئی جس کے اساتذہ اور فارغین کی علمی و تحقیقی خدمات ہماری علمی میراث کا ایک روشن باب ہیں۔

اس دور کے علماء میں امام غزالی، ابو حیان توحیدی، ابوریحان بیرونی، بدیع الزماں سہروردی، مکی بن ابی طالب، عبد القادر جوری اور رابعی اصغری کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خالص دینی اعتقاد سے بھی امام واحدی کا عہد گونا گوں نظریاتی مسائل اور مشکلات سے دوچار تھا۔ دینی فتنے اور مسلکی فرقہ بندیوں کی بجائے وجدال سے گذر کر خوزیز معرکہ آرائیوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ شیعت اور اعتدال کا غلطہ تھا۔ ایسے پر فتن دور میں اللہ کے فضل و کرم سے ایک طرف غزالی اور سلجوقی حکمرانوں نے اپنے سیاسی اور انتظامی ذرائع استعمال کر کے ان فتنوں کا قلع قمع کیا تو دوسری طرف علماء و متکلمین نے علمی اور نظریاتی سطح پر اس چیلنج کا مقابلہ کیا اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد کا سدباب کیا۔ اس صورت حال میں امام واحدی کو اپنے فکر و عقیدہ کے اظہار و تبلیغ میں نہ صرف یہ کہ کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے لیے سازگار ماحول میسر آیا۔

علمی خدمات:

امام واحدی کثیر الجہات علمی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی پوری زندگی علم کے حصول اور اس کی نشر و اشاعت میں صرف ہوئی۔ ان کا شمار ان یگانہ روزگار شخصیتوں میں کیا جاتا ہے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتی ہیں۔ وہ اگرچہ ایک مفسر کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن لغت، نحو، فقہ، حدیث، کلام، ادب، نقد اور شعر و شاعری میں بھی انھیں تبحر حاصل تھا۔ ان علوم میں سے بعض میں ان کی مستقل تصانیف ہیں۔ خود ان کا چھوڑا ہوا تفسیری ذخیرہ تمام علوم و فنون پر ان کی گہری نظر اور محکم گرفت کا مظہر ہے۔ اہل علم ان کی تصانیف کی جامعیت، کمال، حسن تعبیر، طرز استدلال اور فصاحت و بلاغت پر متفق ہیں۔ یوں تو ان کی تصنیفات کا بیشتر حصہ زمانے کی دست برد کا شکار ہو گیا لیکن جو کچھ بھی سراہا ہم تک منتقل ہوا ہے اس کی بنیاد پر ہم ان کا نام علماء اعلام کی فہرست میں جلی حروف سے لکھ سکتے ہیں۔

امام واحدی کی موجود تصنیفات زیادہ تر تفسیر قرآن سے متعلق ہیں۔ عام طور سے ان کی تین تفسیریں "البیضی فی تفسیر القرآن الکریم"، "الوسیط فی تفسیر القرآن الکریم" اور "الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز" مشہور و متداول ہیں۔ ان تفسیروں میں علی الترتیب طویل، اوسط اور مختصر انداز میں قرآن مجید کی تشریح و تفسیر کی گئی ہے۔ طوالت کے باعث پہلی تفسیر زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی جبکہ دوسری اور تیسری کو قبول عام حاصل ہوا اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب قرار دی گئیں۔ تفسیر البیضی کی کل تین جلدیں بتائی جاتی ہیں جبکہ "الوسیط" کی چار جلدیں۔ کچھ روایتوں میں تین، دو اور ایک جلد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان تفسیروں میں

”البيضا“ تو صرف کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہے جبکہ ”الوسيط“ کے بہت سے اہم حصے کتب تفسیر میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ البتہ ”الوجيز“ واحد تفسیر ہے جو عیسیٰ حلبي کی تفسیر ”کتاب تفسیر المیزان لعالم التنزيل“ کے حاشیہ پر مصر سے شائع ہوئی ہے۔ کارل بروکلمان کی روایت کے مطابق ”البيضا“ کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

مذکورہ بالا تین تفاسیر کے علاوہ بھی امام واحدی کی کئی اور تفاسیر ہیں جن کی تعداد آٹھ تک پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے ایک ”الحاوی لمجمع المعانی فی التفسیر“ ہے۔ اس کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ یہ مذکورہ تفاسیر کے لیے صرف نام کے طور پر استعمال کی جانے والی اصطلاح ہے، لیکن راجح بات یہی ہے کہ یہ ایک مستقل بالذات تفسیر ہے اس میں ان تینوں تفاسیر کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ امام واحدی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اپنی تصنیف کو تین دوسری تفسیروں کا ذکر کیا ہے جن کے نام معانی القرآن، مستند القرآن اور مختصر القرآن ہیں۔ بروکلمان کے بیان کے مطابق ان کی ایک تفسیر جامع البيان فی تفسیر القرآن“ کے نام سے استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

تفسیر کے علاوہ دیگر علوم میں بھی انھوں نے تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں علم قرآن سے متعلق ”اسباب نزول القرآن“ کے نام سے بہت مفید اور مشہور رسالہ شامل ہے۔ اسی طرح ”نفي التحريف عن القرآن الکریم“، ”مقابل القرآن“، ”مختصر فی علم فضائل القرآن“ اور ”رسالہ فی شرف علم التفسیر“ کے نام سے ان کے رسائل کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں۔ نحو سے متعلق ان کی دو کتابوں کا پتہ چلتا ہے جن میں سے ایک اعراب پر مشتمل ہے۔ ان کی دیگر تصنیفات میں سب سے مشہور دیوان متنی کی شرح ہے۔ جسے اس دیوان کی بہترین شروح میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ”التجسير فی اسرار اللہ المحسنی“، ”تفسیر اسرار الرسول“، کتاب المغازی، اور کتاب الدعوات والمصول، ان کی معلوم تصنیفات میں شامل ہیں۔ ان میں سے کئی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں بعض منسوخات کی صورت میں کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور بعض کا صرف کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے۔

تفسیری مصادر:

کسی بھی تفسیر کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس کے بنیادی مصادر کے تعین کے

بغیر ممکن نہیں۔ ان مصادر کی نوعیت اور ان کی قلت اور کثرت کی بنیاد ہی پر کسی تفسیر کی افادیت کا انحصار ہوتا ہے۔ امام واحدی کی تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تفسیری مصادر بے حد متنوع اور گونا گوں ہیں۔ ان میں قرآن، حدیث، صحابہ، تابعین، ائمہ تفسیر، نحو، بلاغت، ادب، لغت، فقہ اور کلام شامل ہیں۔ اس سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصادر عقل اور نقل دونوں پر مشتمل ہیں اور صحیح بات یہی ہے کہ ان کی تفسیر تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرأی کا ایک حسین مرقع ہے، مصادر تفسیر کے بارے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ امام واحدی نے اخذ و استفادہ میں کسی طرح کے تعصب یا تحفظ ذہنی سے کام نہیں لیا، چنانچہ مسلک شافعی ہونے کے باوجود انھوں نے فقہ کے چاروں ائمہ سے روایتیں نقل کی ہیں۔ اسی طرح مشہور سخاۃ، ائمہ کلت، فلاسفہ اور متکلمین سے حسب ضرورت استفادہ کیا ہے۔

منہج تفسیر:

ان کی تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام واحدی نے اپنی تفسیر میں ایک مضبوط اور مدلل طرز اختیار کیا ہے وہ تفسیر کے لیے صرف روایات کو کافی نہیں سمجھتے اور نہ ہی خالص عقلی ذرائع کو۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان تال میل اور مطابقت پر یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں اپنے طرز تفسیر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روایات کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ نحو، لغت اور ادب کے مباحث سے تعرض کرنا ناگزیر ہے۔ یہ تینوں علوم تفسیر کے بنیادی ستون ہیں۔

تفسیر بالماثور وبالرأی:

تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرأی کی لفظی بحث سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ عقلی ذرائع کے مناسب استعمال کے بغیر خود تفسیر بالماثور سے پورے طور پر استفادہ ممکن نہیں۔ کتب تفسیر میں مروی روایات کے مابین جو تنوع اور اختلاف پایا جاتا ہے ان کے درمیان مطابقت اور بوقت ضرورت درایت کے اصولوں کو استعمال کرنے ہوئے ترجیحات کا تعین ہونا لازمی ہے۔ امام واحدی نے فی الواقع اپنی تفسیر میں یہی موقف اختیار کیا۔ وہ سب سے پہلے روایتوں کو نقل کرتے ہیں۔ اختلاف روایات کی صورت میں اگر کوئی خاص وجہ نہ ہوتا ہو تو وہ تعرض کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ لیکن بوقت ضرورت کلام عرب،

لغت اور نحو کی مدد سے کسی ایک روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر جمع و تطبیق کی کوئی صورت بن پڑتی ہے تو وہ اسے لوٹی سمجھے ہیں۔ اس پورے عمل میں جو فکری اور اجتہادی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں ان سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، ان کا طرز تفسیر خالص علمی ہے۔ وہ تحلیل و تجزیہ، نقد و تبصرہ اور بحث و تمحیص سے بھرپور کام لیتے ہیں۔ علت و معلول اور مطابقت کی تلاش ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ قدرت نے انھیں حسن ذوق، حسن انتخاب، دقت تعبیر اور دلکش انداز بیان اور اسلوب نگارش سے نوازا تھا، ان تمام صلاحیتوں کا بھرپور انوکاس ان کی تصنیفات میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی تحقیقات کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ بلاشبہ انھوں نے علمی دنیا کو روایات کی چھان بین اور نقد و تبصرہ کے ایک نئے انداز سے روشناس کیا۔

عربی لغت :-

امام واحدی کی تفسیر میں لغوی مباحث بکثرت موجود ہیں۔ ان کے نزدیک لغت کی معرفت تفسیر کے لیے ایک بنیادی ستون کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بغیر تفسیر قرآن میں کوئی قابل لحاظ اضافہ تو کجا، منقولات کا سمجھنا بھی نہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں عربی زبان کی اہمیت اور عظمت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور یہ بتایا کہ عربی زبان پر کامل عبور کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کو زبان کے مسائل اور مشکلات سے تعرض کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن بعد میں عجم سے اقتلاط کی وجہ سے جب اس کے مختلف مسائل اور مشکلات ابھر کر سامنے آئیں تو اس صورت سے عہدہ برا ہونے کے لیے واضح قواعد و ضوابط مرتب کیے گئے۔ اب اگر کوئی شخص کتاب اللہ پر غور کرنے کا خواہش مند ہو تو اسے عربی زبان پر عبور حاصل کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ان کے نزدیک عربوں کی شاعری اور جاہلی کلام کا مطالعہ زیادہ مفید ہوگا۔ لغت کے اسرار و رموز اور شکل و غریب الفاظ سے مکمل واقفیت کے بغیر تفسیر میں اجتہادی شان، تجزیاتی اسلوب اور تنقیدی نظر پیدا نہیں ہو سکتی۔

امام واحدی کی تفسیر میں لغت کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ امام تفضلی اور زرکشی نے اسے لغوی تفسیر قرار دیا ہے حالانکہ ان کی تفسیر اور بھی کئی پہلوؤں سے قابل توجہ ہے۔ لغت کے اعتبار سے ان کی تفسیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید کی عربیت کا ہر جگہ دفاع کیا گیا ہے اور غریب اور مشکل الفاظ کی بہترین تشریح کی گئی ہے۔ اس میں مفرد الفاظ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ لغوی مباحث

کا بالعموم طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے الفاظ کے اصلی حروف کا پتہ لگایا جاتا ہے پھر اس کے مختلف مشتقات پر بحث کرتے ہوئے صحیح معنی کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ لغت پر عبور کی وجہ سے تفسیری روایات کی تطبیق، ترجیح اور توجیہ میں بھی بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ اس کی وجہ سے انھوں نے اگر لغت کی تسامحات کی بھی نشاندہی کی ہے اور فقہی روایات کے وجوہ اختلاف بیان کیے ہیں۔

علمِ نحو:

دیگر مفسرین کی طرح امام واحدی کے یہاں بھی تفسیر قرآن کے لیے نحو کی اہمیت اور ضرورت مسلم ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کلمات کی ہیئت، صیغہ، ترکیبی محل اور تعریف و تنکیر کا لحاظ کیے بغیر عبارت کے اصل مفہوم و مدعا تک رسائی ناممکن ہے۔ عربی زبان و ادب میں نحو کی اسی اساسی اہمیت کے پیش نظر اس پر ابتدا اور ہی سے خاطر خواہ توجیہ دی گئی۔ کوفہ و بصرہ میں اس کے اسکول قائم ہوئے اور ان کی کوششوں سے نحو کے اصول و قواعد منضبط ہو گئے۔ امام واحدی نے اپنے وقت کے کبار علماء نحو سے استفادہ کیا اور اس فن کی جزئیات پر کامل عبور حاصل کیا۔ ان کی تفسیر میں اس کے مظاہر جگہ جگہ موجود ہیں۔ نحو سے متعلق شاید ہی کوئی بحث ان کے احاطہ سے باہر رہ گئی ہو۔ وہ صرف نحو کے مسائل ہی سے تعرض نہیں کرتے بلکہ اگر نحو کے اقوال پر نقد و تبصرہ اور ان کے مابین تطبیق و ترجیح کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اپنی باریک بینی اور ثررف نگاہی کی وجہ سے وہ باسانی مسائل کی ریشہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ نص قرآنی کی شرح و توضیح اور توجیہ و تاویل میں ان پر اس علم کا اس قدر غلبہ تھا کہ بعض لوگوں نے انھیں نحوی مفسرین کی صف میں کھڑا کر دیا۔ حالانکہ یہ ان کی تفسیر کے دوسرے علمی اور فنی پہلوؤں سے صرف نظر کے مترادف ہے۔

عربی ادب:

عربی ادب سے بھرپور واقفیت تفسیر کلام اللہ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ کلام کے اہم اجزاء مثل استعارات، تشبیہات، امثال وغیرہ کے مفہوم و مدعا تک رسائی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ ادبی ذوق کے فقدان کے باعث قرآنی نصوص کی وضاحت میں بعض مفسرین نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ امام واحدی ادب کی اس اہمیت سے واقف تھے۔ ان کی تفسیر میں یہ پہلو بہت واضح ہے۔ انھوں نے پوری زندگی عربی زبان کے

فہم و شفا چشموں سے فیض حاصل کیا اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کے اسالیب اور معانی تک رسائی حاصل کی۔
تفسیر قرآن کے لیے ان کے ادبی منہج کی ایک مضبوط اساس تھی۔ وہ سب سے پہلے الفاظ کی لغوی تحقیق کرتے ہیں۔ اس کام میں ان کا سب سے بڑا ذریعہ عرب شعراء کا کلام ہے جسے دیوان العرب کہا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ عبارتوں کی مجموعی صورت حال پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کے ذریعہ عبارتوں کا حسن اور لطافت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ، عبارتوں کے اندر آبدار موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ قرآن مجید کے اسلوب بیان کی فنی خوبیوں کو اس تفسیر نے جس طرح اجاگر کیا ہے اس کی بنیاد پر اسے ایک ادبی تفسیر کہا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اہل علم واقف ہیں ادبی تفسیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں تخیلات اور ادبی کیفیات کو جمع کر دیا جائے بلکہ دراصل اس سے مراد زبان و ادب کے جواہر پاروں کی ایسی ترتیب و تنظیم ہوتی ہے جس سے معانی پورے شرح و بسط کے ساتھ سامنے آجائیں اور اسالیب کی جدت، تعبیرات کی لطافت اور تراکیب کی ندرت قارئین پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے۔ اس طرح کی ادبی تفاسیر سے روح انسانی پر ایک استہزائی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، دل کی دنیا زبردیں ہو جاتی ہے اور وجدان پر ایک ارتعاش و تموّج کا عالم طاری ہو جاتا ہے جبکہ علمی تفاسیر صرف عقل و فکر کو مخاطب کر پاتی ہیں۔

امام واحدی کے نزدیک فن کا کامل و مکمل نمونہ قرآن مجید خود ہے۔ وہ کلام عرب سے استشہاد ضرور کرتے ہیں لیکن کسوٹی بہر حال قرآن مجید ہی ہوتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر وہ کلام عرب پر نقد و تبصرہ بھی کرتے ہیں اور اسی کے میاں پر وہ اس کے محاسن و معائب کو پرکھتے ہیں۔ دوران گفتگو وہ ان ادباء اور شعراء کی نشاندہی بھی کرتے جاتے ہیں جن کے کلام پر قرآن مجید کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ مختلف مقاصد کے تحت واحدی نے اپنی تفسیر میں عربی شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا کر دیا ہے۔ ان میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو صرف ان کی تفسیر ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق زیادہ تر جاہلی اور اسلامی شعراء سے ہے۔ بعد کے شعراء سے انھوں نے کم ہی استفادہ کیا ہے بالعموم وہ صرف منتخب اشعار ہی سے استشہاد کرتے ہیں اور انھیں ہر طرح کے ربط و یالیں کو جمع کرنے سے دلچسپی نہیں ہے۔ ان سے لغوی تحقیق، نحوی مباحث، اعراب کی شکلیں، فنی اوصاف، قرارت اور فقہی اختلافات کے اسباب کی وضاحت میں مدد لی گئی ہے۔ اشعار کی روایت میں ان سے بعض بے احتیاطیاں بھی ہوئی

ہیں۔ لیکن ان سے ان کی قدر و منزلت پر بحیثیت مجموعی کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

علم بلاغت:

امام واحدی نے اپنی تفسیر میں علم بلاغت سے بھی بھرپور مدد لی ہے۔ قرآن مجید کی ادبی عظمت، نظم، اعجاز اور ایجاز پر گفتگو کرنے کے لیے اس علم سے صرف نظر ممکن نہ تھا۔ امام واحدی کے زمانہ تک علم بلاغت کی باقاعدہ تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی۔ علم البیان، علم المعانی اور علم البدیع کے مباحث باہم خلط ملط تھے۔ اس کی وجہ سے ان کی تفسیر میں بھی بعض مقالات پر خلط مبعث ہوا ہے۔ ان کی تفسیر میں بلاغت کے جواہر، آہستہ آہستہ ان میں فصل و وصل، التفات، تقدیم و تاخیر، قصر، تعبیر بالماضی، عن المضارع، تعبیر بالمضارع عن الماضی، حذف، استفہام، تشبیہ، استعارہ، مجاز، کنایہ، تعریض، مشاکدہ، مقابلہ، تقسیم اور لف و نشر وغیرہ شامل ہیں۔ ان مباحث کے ذریعہ انہوں نے قرآنی تراکیب کی خصوصیات، لطیف معانی اور نظم کلام کی وضاحت کا کام لیا ہے، الفاظ کے حقیقی اور مجازی مدلول کے تعین میں بھی اس سے مدد لی ہے۔ ان کے ذریعہ کبھی کبھی علم بلاغت کی مذکورہ اقسام کے تحلیل و تجزیہ اور توجیہ و تاویل کا کام بھی لیا گیا ہے۔ ان سب سے واحدی کے سن ذوق اور قوتِ ادراک کا پتہ چلتا ہے۔

علم قرارت:

امام واحدی کی تفسیر کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں قرآن مجید کی مختلف قرارتوں کے حوالہ سے معانی کی وضاحت اور توجیہ و تاویل کی کوشش کی گئی ہے، قرارتوں کی توجیہ و تاویل کا کام خاصہ مشکل ہے۔ روایت و درایت کے تمام اصولوں اور لغت و نحو کے تمام پہلوؤں سے واقفیت صحیح طور پر اس کام کی انجام دہی کی بنیادی شرط ہے۔ خود قرارت کی بحث علوم قرآن کی ایک اہم بحث ہے۔ اس کی متعدد قسمیں بیان کی جاتی ہیں جن میں متواتر اور مستند سے لے کر غریب اور موضوع تک شامل ہیں۔ مفسرین بالعموم قرأت کے ائمہ سید سے روایتیں نقل کرتے ہیں اور زیادہ تر راجح قرارتوں کو بنیاد بنا کر توضیح و تفسیر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ جبکہ امام واحدی نے ان سات ائمہ کے علاوہ بھی دوسرے

قرآن سے روایتیں نقل کی ہیں یہاں تک کہ بعض شاذ اور نادر قرار میں بھی بطور استدلال شامل کر لی ہیں کبھی کبھی وہ ایک ہی مقام پر آٹھ دس روایتوں کو بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن کے نام کی صراحت بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مصاحف قرأت کا حوالہ بھی آجاتا ہے۔ اس طرح کی روایتوں میں عموماً سند کا التزام کرتے ہیں۔ قراروں سے استدلال اور استفادہ میں اس قدر اہتمام اور استقبصار کے باعث طبقہ مفتخر میں وہ ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ ان کے استدلال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف قراروں کے درمیان اختلاف اور تعارض کی شکل میں توازن اور تطبیق کی کوشش کرتے ہیں اور حتیٰ الامکان تعلیظ و تردید سے احتراز کرتے ہیں۔ شاذ اور نادر قراروں کے تذکرے سے ان کا مقصد بالعموم بیش از بیش افادہ ہوتا ہے۔ ان کے درلیو اہل علم نے مخوی ضوابط کے اثبات اور توجیہ کا کام بھی لیا ہے۔ قراروں کے مابین ترجیحات کے تعین میں ان کے سب سے بڑے ذرائع کتاب و سنت، سنت، لغت، نسخ اور دیگر قرار میں ہوتی ہیں۔

احادیث نبوی:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے سب سے بہترین شارح تھے۔ اس لیے تفسیر قرآن کے باب میں حدیث کو جو اساسی اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ دوسرے مفسرین کی طرح امام واحدی نے بھی تفسیر قرآن میں حدیث سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور نتیجتاً ان کی تفسیر میں حدیث نبوی کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے۔

تفاسیر کے علاوہ ان کی دیگر تصنیفات میں بھی حدیث کی قابل لحاظ تعداد پائی جاتی ہے۔ ان احادیث سے زیادہ تر اسباب نزول، نہی قرآنی کی تشریح، غریب الفاظ کی چھان بین، قرأت، فضائل سورا اور فقہی احکام کے استنباط میں مدد ملی گئی ہے۔ ان احادیث کی روایت کے سلسلے میں ان کا طریقہ اور منہج "الوسیط" اور "الوسیط" میں الگ الگ رہا ہے۔ "الوسیط" میں اہل علم نے روایت پر زیادہ توجہ دی ہے، استدلال زیادہ تر مرفوع ہیں اور مجموعہ احادیث کی وضاحت بھی کم ہے جب کہ "الوسیط" میں روایت پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اسناد متصل ہیں۔ اور مجموعہ احادیث کا بھی تذکرہ ہے۔ ان کی روایت کردہ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صحت یاد رہے گفتگو کم کی

گئی ہے، گریبا انھوں نے جرح و تعدیل سے خود کو بچانا چاہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث کی اسناد وغیرہ پر گہری نظر رکھنے کے باوجود ان کی تفسیر ضعیف روایتوں سے خالی نہیں ہے۔ خاص طور سے سورتوں کے فضائل کے بیان میں ایسے سلسلہ اسناد سے بھی روایتیں لے لی گئی ہیں جن سے روایت نہ کرنے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ اس معاملے میں ان کا معاملہ دیگر مفسرین سے مختلف نہیں رہا البتہ شاید ان کا امتیاز یہ ہو کہ انھوں نے سلسلہ سند کی صراحت بھی کر دی ہے۔ جبکہ زعمشری وغیرہ نے اسکی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اس کمی کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ امام واحدی روایت حدیث کی بابت اپنی مختلف خوبیوں کی بنیاد پر تمام مفسرین کے درمیان ایک منفرد مقام دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

اسرائیلیات :

تفسیر قرآن سے متعلق ایک اہم بحث یہ رہی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر و توضیح کے سلسلہ میں کس حد تک اسرائیلیات پر اعتماد کیا جائے اور کہاں تک ان کو استعمال کیا جائے۔ اسرائیلیات سے مراد وہ روایتیں ہیں جو اسرائیلی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں بلکہ یہ اصطلاح اور زیادہ عام ہو گئی اور تمام من گھڑت روایتوں کے لیے استعمال کی جانے لگی خواہ ان کے راوی یہودی ہوں یا کوئی اور۔ اسلام کی آمد سے قبل ہی یہودیوں کے ذریعہ انھماضیہ کے سلسلہ میں عربوں کے درمیان بہت سی حکایتیں مشہور ہو چکی تھیں۔ چونکہ ان کا تعلق انبیاء و صلحاء سے تھا اس لیے نزول قرآن کے بعد اس میں وارد بہت سے قصص کی وضاحت اور تفصیل کے لیے ان سے رجوع کیا گیا۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں یہ سلسلہ تقریباً ہونے کے برابر تھا، لیکن بعد میں اس باب میں اتنی احتیاط نہ ہو سکی اور نتیجہً اس نوع کی بہت سی روایتوں نے تفسیری ذخیرہ کے اندر راہ پالی۔ اس طرح کی تمام روایتوں کا معاملہ ظاہر ہے یکساں نہیں ہے۔ ان میں سے بعض قرآن مجید کے بیانات اور تصریحات سے متصادم نہیں تھیں اس لیے ان کی روایت میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن اسرائیلیات کا ایک بڑا حصہ رطب و یابس پر مشتمل ہے چنانچہ ان کے باب میں غیر معمولی وقت نظر اور احتیاط کی ضرورت ہے لیکن اس سلسلہ میں اکثر خاطر خواہ احتیاط نہ ہو سکی اور بہت سے مفسرین نے بھی وضاحت مزید اور تفصیل کی خاطر ایسی بہت سی روایتوں کو اپنی تفسیروں میں جمع کر دیا اور واقعہ یہ ہے کہ بہت کم

مفسرین ان سے محفوظ رہ سکے، حتیٰ کہ ابن عطیہ بھی ابن کی تفسیر کو ابن عدلون نے اسرائیلیات سے خالی قرار دیا ہے، اس سے اپنے دامن کو یکسر نہیں بچا سکے۔

مقام حیرت ہے کہ امام واحدی جیسے بالغ نظر اور فاضل روزگار مفسر نے بھی اس سلسلہ میں کچھ زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھی چنانچہ ان کی تفاسیر میں اسرائیلیات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اس سلسلے میں وہ قرطبی اور طبری کے قریب نظر آتے ہیں یہاں تک کہ ان کی تفسیر میں وہ روایات بھی ملتی ہیں جن سے انبیاء کرامؑ اور صلحاء و عظام کی سیرتوں کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس کے ذمہ دار امام واحدی نہیں ہیں انہوں نے تو مفسرین سے اسناد کے ساتھ روایتیں نقل کی ہیں، لیکن اگر وہ اپنی خداداد فکری و عقلی صلاحیتوں کو استعمال کرتے اور روایت کے بجائے روایت کے اصولوں کو سامنے رکھتے تو یہ بے بنیاد باتیں ان کی تفسیروں میں جگہ نہ پاتیں اور اسرائیلیات کے باب میں ان کا طرز عمل بھی امام رازی، آلوسی اور ابن کثیر کی طرح لائق ستائش ہوتا۔

آیات احکام :

امام واحدی فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، فقہ کے مختلف مسالک اور مکاتب پر ان کی گہری نظر تھی، وہ نقد و تبصرہ اور استنباط و اجتہاد کی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مختلف اقوال کے درمیان توجیہ اور ترجیح دینے کی صلاحیت بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی اس طرح ان کی شخصیت میں وہ تمام لوازم موجود تھے جن کی ضرورت آیات احکام کی تفسیر میں پڑ سکتی تھی۔

آیات احکام پر بحث کرنے کا ان کا انداز یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے الفاظ کی لغوی تحقیق کرتے ہیں پھر ان آیات کا شان نزول جانتے ہوئے ان میں وارد احکام کی کتاب و سنت کی روشنی میں تشریح کرتے ہیں اور آخر میں اس سلسلہ میں شافعی مسلک کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے مسالک کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی تفسیر کو فقہ کے تقابلی مطالعہ کے لیے ایک اچھی کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ صرف مسالک کے تذکرہ پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ زیر بحث مسئلہ کے سلسلہ میں ان کے دلائل کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس سے بھی آگے ان کو بخت و تجزیہ کی کسوٹی پر رکھتے بھی ہیں اور جہاں کہیں ممکن ہوتا ہے جمع و تطبیق اور موازنہ و مقابلہ کا کام

بھی انجام دیتے ہیں۔ اپنے مسلک کی تائید اور حمایت میں مبالغہ آمیز اور جارحانہ انداز کے بجائے نرم اور مدلل طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مضبوط دلائل کی بنیاد ہی پر اپنے مسلک کی حمایت کی ہے۔ مختلف فقہاء کے خیالات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے میں وہ زیادہ ترقییت اور بعیدیت پر انحصار کرتے ہیں۔ خود امام شافعیؒ کے سلسلے میں کئی مقامات پر ان کا طریقہ یہی رہا۔ فقہی اقوال کے نقل کرنے میں ان کی حد درجہ احتیاط کے باوجود بعض جگہوں پر ان سے چونک بھی ہوئی ہے خاص طور سے ان اقوال پر نقد و تبصرہ میں بسا اوقات خرم و احتیاط کا دامن چھوٹا نظر آتا ہے۔ لیکن ان کے معروف معروضی اور مثبت انداز کی روشنی میں اسے محض ان کے قلمی تسلیح پر دل کرنا چاہیے۔ اس سے ان کی عظمت اور فقہی بصیرت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔

علم کلام :

تفسیر قرآن میں علم کلام کی ضرورت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ خاص طور سے تاریخ اسلام کی ابتدائی پانچ صدیوں میں جب کہ منطق و فلسفہ کا رواج عام تھا اور مختلف فرقے ان کی مدد سے اپنے عقائد کا اثبات اور دوسرے فرقوں کے افکار و عقائد کا ابطال کرنا چاہتے تھے، علماء اہل سنت و الجماعت نے علم کلام کے درلودین حنیف کے دفاع کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ امام واحدی نے اپنی تفسیر میں اسلاف کی اس روایت کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اسے چار چاند لگا دیا۔ سلف سے منقول تفسیری روایات اور علم لغت وغیرہ پر کامل دسترس کی وجہ سے انھوں نے ان آیتوں کی صحیح تاویل پیش کی جو باطل فرقوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ ان کے زمانے میں جن فرقوں نے قرآنی آیات کو اپنے گمراہ کن خیالات کے لیے استعمال کیا تھا ان میں معتزلہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس فرقے کے بعض مفسرین کی تفسیریں کافی مشہور ہوئی ہیں۔ وقت کی یہ ایک بڑی ضرورت تھی کہ صحیح الفکر علماء کی طرف سے ان غلط تاویلات کا شافی اور مسکت جواب آئے۔ امام واحدی نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس ضمن میں انھوں نے جن مباحث پر توجہ دی ہے ان میں خاص طور سے رویت باری تعالیٰ، عصمت انبیاء، وحی، ایمان، توحید، عدل، وعدہ و وعید، امر بالمعروف و نہی عن المنکر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنے عام طریقہ کے مطابق ان مباحث میں قرآن و سنت اور نحو و لغت وغیرہ سے استدلال کیا ہے۔ ان کا انداز

۱۵۹۳۳۳

گنگو مثبت اور تقریری بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اس میں مجادلہ اور مباحثہ کا رنگ بھی آجاتا ہے۔ اس نوعیت کے بعض مباحث غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور وہاں وہ دوسرے سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔

دیگر علوم قرآن :

مذکورہ بالا سطور میں تفسیر اور اس کے بہت سے پہلوؤں کے بارے میں امام واحدی کے موقف کی کسی حد تک صراحت آچکی ہے۔ لیکن علوم قرآن کے بعض دوسرے پہلوؤں کے بارے میں وضاحت سے کوئی بات نہیں کہی جاسکی اگرچہ امام واحدی کی تحریروں میں ان موضوعات پر بھی بہت کچھ مواد ملتا ہے۔ ان میں اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، اعجاز قرآن، اول مازل من القرآن اور تصوف خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان علوم کے بارے میں عام طور سے ان کے خیالات سلف سے ماخوذ و مستفاد ہیں۔ اسباب نزول پر ان کا ایک دقیق رسالہ بھی ہے جو اپنے موضوع پر اپنی مثال آپ ہے۔ البتہ تصوف کے بارے میں وہ بعض اسلاف سے الگ موقف رکھتے ہیں۔ انھوں نے تفسیر صوفی پر سخت تنقید کی ہے اور اس قبیل کی بعض تفاسیر (مثلاً عبدالرحمان سلمی کی تفسیر "تقائق القرآن") کو قرآنی تفسیروں کی فہرست سے خارج قرار دیا ہے جس سے ڈاکٹر جوہدہ محمد البوزید سخت نالاں ہیں۔

تفسیری مقام و مرتبہ:

بمبیت مفسر امام واحدی کا مقام بے حد بلند ہے۔ وہ اپنے معاصرین میں سب سے فائق نظر آتے ہیں بعد کے لوگوں نے بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ امام غزالی سے ایک بار قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے کہا کہ واحدی کی تفاسیر کے بعد اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فقہ کی تین کتابوں کے نام ان کی تفاسیر کے ناموں سے اخذ کیے ہیں۔ ان کے ایک معاصر حافظ عبدالغافر فارسی نے انھیں "استاذ عصر" اور "واحد عصر" کا لقب دیا۔ حافظ ذہبی نے انھیں امام اہل التلوین قرار دیا ہے بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں "مثل عصرہ فی التفسیر" اور امام عصرہ فی التفسیر کے القاب سے بھی نوازا ہے۔ اپنی جلیل القدر خدمات کی بنیاد پر وہ بعد کے تمام مفسرین کے لیے مرجع بن گئے۔ امام فخر الدین رازی اور امام آلوسی ان سے خاص طور سے متاثر ہوئے۔

اول الذکر کی تفسیر میں امام واحدی کے اقوال کثرت سے منقول ہیں۔ دوسرے مفسرین میں قرطبی، ابوحیان، خطیب شربینی اور جلالین وغیرہ پر اُن کے اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ اُن کے بارے میں اُن ہی کے ایک معاصر اہل علم نے بہت خوب کہا:-

قد جمع العالم في واحد
عالمنا المعروف بالواحدی

ان کا
کتاب
۱۲۷۹
"جامع"
آداب
مخبر
عاری
پلاستک
واپس
پچھلی

شیخ محمد عبدہ کی تفسیری خدمات

شیخ محمد عبدہ ۱۲۶۵ھ - ۱۸۳۹ء میں مصر میں ضلع "البحیرۃ" کے ایک گاؤں "محلہ نصر" میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدہ بن حسن خیر اللہ گاؤں کے انتہائی باوقار اور بااثر لوگوں میں سے تھے۔ ہمدردی و غمگساری، جو دو سخا اور خدمت خلق میں ان کا ایک منفرد مقام تھا۔ وہ حق کی حمایت، عہد کی پاسداری اور مخالفتوں کے بالمقابل صبر و ثبات کی صفات سے بھی متصف تھے۔ ان کی والدہ "سیدہ حسینہ" بھی ایک نیک اور ذی حیثیت خاتون تھیں۔ فقیروں اور محتاجوں کی حمایت اور پریشان حال لوگوں کی مشکلات کا ازالہ ان کا امتیازی وصف تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے والدین کی مذکورہ خوبیاں وراثت میں پائی تھیں (۱)

ان کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام گاؤں کے مکتب کے بجائے گھر پر ہوا۔ والد صاحب نے ان کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو انہیں گاؤں کے مکتب میں بھیج دیا گیا جہاں ایک حافظ سے انہوں نے قرآن پڑھا پھر دو سال میں اسے حفظ کیا (۲)۔ ۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء میں قرآن پاک کی تجوید اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے وہ شہر طحطا کی مسجد "جامع احمدی" میں قائم مدرسہ میں داخل ہوئے۔ قرآن مجید کی تجوید اور اس کے اصول و آداب سے انہوں نے جلد ہی واقفیت حاصل کر لی۔ بعض دوسرے علوم خاص طور سے نحو و صرف اور فقہ کی تعلیم ان کے لئے مشکل ثابت ہوئی کیونکہ اساتذہ قدیم طرز تدریس کے عادی تھے اور فقہی و نحوی مسائل کو اپنے مخصوص طریقہ تعلیم کی وجہ سے اور زیادہ پیچیدہ بنا دیتے تھے۔ نتیجہ ڈیڑھ سال کے ناکام تجربہ کے بعد وہ جامع احمدی سے دل برداشتہ ہو کر گھر واپس چلے گئے اور کھیتی باڑی کے کاموں میں حصہ لینے لگے۔ تعلیم سے بے رغبتی اور عدم دلچسپی کو دیکھ کر ان کے والدین نے ۱۲۸۲ھ - ۱۸۶۵ء میں ان کی شادی کر دی۔ (۳)

شادی کے بعد ان کے والد نے ایک بار پھر ان پر تعلیم کے لئے دباؤ ڈالا اور انہیں زبردستی ”طنطا“ بھیج دیا۔ وہ گھر سے اسکول کیلئے روانہ ہوئے لیکن تعلیم کے لئے آمادگی نہ ہونے کی وجہ سے راستے میں واقع ایک گاؤں ”کنیہ اورین“ میں رک گئے۔ یہاں ان کے والد کا ناہمال تھا اس لئے گاؤں کے اکثر لوگ رشتہ دار ہوتے تھے۔ اتفاق سے اس گاؤں میں ان کی ملاقات شیخ درویش خضر سے ہو گئی جو ان کے والد کے ماموں ہوتے تھے۔ وہ حافظ قرآن اور محدث تھے اور تصوف کے سلسلہ شاذلیہ سے منسلک تھے۔ انہوں نے لیبا اور طرابلس کا سفر کیا تھا اور مشہور صوفی بزرگ سید محمد مدنی سے کسب فیض کیا تھا۔ ان کی صحبت نے شیخ محمد عبدہ کی زندگی پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا (۴)، اس کے نتیجے میں ان کے اندر دین سے شغف، تعلیم سے محبت اور بدعات و خرافات سے اجتناب کا داعیہ پیدا ہوا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

تفرقت عنی جمیع الہموم ولم یبق الا ہم واحد وهو ان اکون
کامل المعرفة، کامل ادب النفس ولم اجد اماما یرشدنی الی ما
وجہت الیہ نفسی الا ذلک الشیخ الذی اخرجنی فی بضعة ایام
من سجن الجهل الی فضاء المعرفة و من قیود التقليد الی اطلاق
التوحید. هذا الشیخ هو مفتاح سعادتی ان کانت لی سعادة فی
هذه الحیاة الدنیا. (۵)

میری تمام الجھنیں جاتی رہیں بس ایک فکر باقی رہ گئی کہ میں علم و معرفت اور تہذیب و سلیقہ میں کامل ہو جاؤں لیکن مجھے کوئی امام (رہنما) نہیں ملا جو میرے عزائم میں میری رہنمائی کرنا سوائے اس شیخ کے جس نے مجھے چند دنوں میں جہالت اور تقلید کے قید و بند سے آزاد کر کے معرفت اور توحید خالص کی کشادہ فضا میں داخل کر دیا تھا اگر مجھے دنیا میں سعادت کا کوئی حصہ نصیب ہوا ہے تو اس کی کلید یہی شیخ ہیں۔

”کنیہ اورین“ میں پندرہ دن کے قیام کے بعد وہ تکمیل تعلیم کیلئے طنطا روانہ ہو گئے، اس وقت تعلیمی سال اختتام کے قریب تھا لیکن پیہم جد و جہد اور مکمل انہماک کی وجہ سے انہوں نے بہت جلد نصاب تعلیم کی خواندگی کر لی اور ممتاز طالب علموں میں شمار کئے جانے

لگے، امتحان سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے عالمیت کی سند کے حصول کے لئے ۱۲۸۲ھ۔
 ۱۸۶۶ء میں جامعہ ازہر میں داخلہ لیا (۶)، اس وقت جامعہ ازہر کا نظام تعلیم نہایت فرسودہ تھا۔
 اساتذہ کی ذمہ داریاں متعین نہیں تھیں۔ طلبہ پر تعلیم کیلئے کوئی دباؤ نہیں تھا۔ ان کی رہائش اور
 طعام کا انتظام بھی حد درجہ ناقص تھا۔ نظام کے نام سے اگر وہاں کوئی چیز تھی تو صرف یہ کہ
 طلبہ کا نام وہاں داخلہ کے وقت رجسٹر میں درج کر لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ متعین مدت
 گزار کر عالمیت کے امتحان کیلئے مستحق قرار پاتا تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے بھی وہاں کل بارہ سال قیام کیا
 (۷)، ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چھٹیوں میں اپنے وطن آجاتے تھے اور اپنے پیرومرشد شیخ درویش
 خضر کو پورے سال کی تعلیمی پیش رفت سے آگاہ کرتے تھے۔ شیخ ان کو مناسب مشورے دیتے
 تھے اگر کسی علم یا فن کے بارے میں ان کی معلومات ناقص ہوتیں تو وہ ان کی تلافی کی شکلوں کی
 نشاندہی کرتے تھے، جامعہ ازہر کے قدامت پرست علماء کی اکثریت علوم عقلیہ کی تدریس کو
 دینی مصالح کے منافی سمجھتی تھی۔ شیخ درویش نے انہیں بتایا کہ علم کے حصول میں کسی تعصب
 سے کام نہیں لینا چاہیے اور ہر طرح کا علم پورے ذوق و شوق سے حاصل کرنا چاہیے (۸)۔

جامعہ ازہر میں قیام کے دوران شیخ محمد عبدہ کو اپنے استاذ شیخ حسن طویل سے خصوصی
 فائدہ پہنچا۔ وہ ازہری علماء میں اپنی کشادہ ذہنی، حریت فکر اور علوم عقلیہ میں مہارت کی وجہ سے
 منفرد مقام رکھتے تھے۔ عبدہ نے ان سے ریاضی، فلسفہ اور سیاسیات کا درس لیا اور وہ انہیں کی
 وساطت سے جامعہ ازہر میں قائم حلقہ تصوف سے منسلک ہوئے۔ یہ حلقہ مشہور ازہری صوفی
 حسن رضوان کے تلامذہ اور مریدین پر مشتمل تھا۔ (۹)

محمد عبدہ انتہائی بیدار اور تیز ذہن و دماغ کے مالک تھے۔ دوران تعلیم ان کے ذہن میں
 جدید و قدیم علوم سے متعلق ہزاروں سوالات ابھرتے۔ وہ ان علوم کے درمیان توافقی کے حامی
 تھے، اسی طرح سماجیات، اقتصادیات اور سیاسیات سے متعلق جدید مسائل سے واقفیت اور ان
 کی مدد سے مصر اور پورے عالم اسلام کی اصلاح بھی ان کی دلی آرزو تھی۔ انہیں اس بات کا
 شدید قلق تھا کہ ازہری علماء ان کی علمی تشنگی اور فکری احتیاج کی تکمیل سے قاصر تھے۔ شیخ
 درویش خضر اور شیخ حسن طویل نے ان کو فکر و عمل کی ایک راہ ضرور دکھائی تھی لیکن یہ
 دونوں حضرات بھی ان کی اعلیٰ ذہنی و فکری استعداد کے مطابق ان کی رہنمائی نہیں کر سکے۔

اس صورتحال میں شیخ جمال الدین افغانی سے ان کا تعارف اور تلمذ ان کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی، افغانی ۱۲۸۸ھ - ۱۸۷۱ء میں مصر آئے۔ (۱۰) وہ مصر میں ایسے علماء کی ایک جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو ان کے افکار و خیالات کی ترجمان بن سکے۔ محمد عبدہ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ ان سے عربی اور اسلامی علوم سے متعلق بہت سی اہم کتابوں کے علاوہ فلسفہ، تاریخ، سیاست اور معاشرت پر منتخب اور مشہور یورپی علماء کی تصانیف بھی پڑھیں، ان کتابوں سے وہ علم و فکر کے نئے انداز اور زاویوں سے واقف ہوئے اور انہیں علمی طور سے ایک ایسی توانائی اور اعتماد و استحکام حاصل ہوا جو اب تک کے اساتذہ اور کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ اس تعلق و تلمذ سے انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ حریت فکر اور اصلاح معاشرہ کا جو تصور ان کے استاذ اول شیخ درویش خضر نے پیش کیا تھا، افغانی نے اسے جلا بخشنا اور اس کے علمی اظہار کے وسائل سے روشناس کیا۔ اس کے نتیجہ میں انہیں یہ یقین و شعور حاصل ہوا کہ ان کے اصلاحی تصورات محض فلسفیانہ نظریات نہیں تھے بلکہ قابل عمل پروگرام کی حیثیت رکھتے تھے۔ (۱۱)

۱۲۹۲ھ - ۱۸۷۷ء میں ۲۸ سال کی عمر میں شیخ محمد عبدہ کو جامعہ ازہر کی طرف سے عالمیت کی سند عطا کی گئی حالانکہ جمال الدین افغانی سے تعلق اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر ازہری علماء ان سے بہت زیادہ ناراض تھے۔ سند عالمیت کے حصول کے بعد اب وہ جامعہ ازہر میں درس و تدریس کے لئے اہل اور مستحق ہو چکے تھے۔ ان کے اصلاحی پروگرام کے نفاذ کے لئے بھی یہ ایک مناسب شکل تھی۔ چنانچہ انہوں نے جامعہ ازہر میں منطق و فلسفہ کا درس دینا شروع کیا۔ اس میں طلبہ بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ اسی دوران قاہرہ کے مشہور ڈگری کالج دارالعلوم میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا، انہوں نے اس مضمون کی تدریس کے لئے روایتی انداز کی کسی تاریخی کتاب کے بجائے ”مقدمۃ ابن خلدون“ کا انتخاب کیا۔ وہ اپنی فکر کو عام کرنے کی غرض سے اپنے گھر پر منتخب طلبہ کو الگ سے پڑھایا کرتے تھے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے ”مدرسة الادارة و الألسن الخدیویة“ میں بھی ایک مضمون کی تدریس کا ذمہ لے لیا۔ (۱۲)

۱۸۷۹ء میں جمال الدین افغانی کو انگریزوں کی ایما پر مصر سے چلے جانے کا حکم دیا گیا۔

انگریز جمال الدین افغانی کے سخت مخالف تھے کیونکہ اتحاد امت، آزادی رائے اور جمہوریت پر
 مبنی ان کے خیالات کی زد براہ راست انگریزوں کے مفادات پر پڑتی تھی۔ افغانی سے تعلق
 خاطر کی بنیاد پر محمد عبدہ بھی حکومت کے عتاب کے شکار ہوئے۔ انہیں ملازمت سے
 برخاست کر دیا گیا اور انہیں اپنے گاؤں جانے اور وہیں قیام کرنے کا حکم دیا گیا۔ جس وقت
 افغانی مصر چھوڑ کر جا رہے تھے انہوں نے اپنے سوگوار اور ملول شاگردوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

ترکت لکم الشیخ محمد عبدہ و کفی بہ لمصر عالما۔ (۱۳)

۱۸۸۰ء میں مصری وزیر اعظم ریاض پاشا کی کوششوں سے ان کی نقل و
 حرکت پر عائد پابندی ختم کر دی گئی اور وہ قاہرہ واپس چلے آئے جہاں بہت جلد انہیں سرکاری
 گزٹ "الوقائع المصریة" میں ملازمت مل گئی۔ بعد میں ترقی دے کر انہیں اس گزٹ کا
 ایڈیٹر بنا دیا گیا، (۱۴) انہوں نے اس موقع کو اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے بہت مناسب
 تصور کیا چنانچہ انتہائی موثر اور حکیمانہ انداز میں اپنی دعوت اہل مصر کے سامنے پیش کی۔ ان کی
 اصل توجہ آزادی رائے، عدل و انصاف اور شورایت کے تصورات کو عام کرنے پر مرکوز
 تھی۔ وہ قوم کی ترقی کیلئے تعلیم کو ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ سب سے پہلے
 دین اور اس کی حقیقی تعلیمات سے عوام کو متعارف کرانا چاہیے اور ان کے مطابق انہیں
 زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔ اسکے بعد ہی وہ اصلاح کے ہمہ گیر مفہوم سے آشنا ہوں
 گے۔ اور اصلاحات کے نفاذ میں اپنا تعاون پیش کر سکیں گے۔ (۱۵)

۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ "الوقائع المصریة" کے ایڈیٹر تھے، عراقی انقلاب کے شعلے
 پورے مصر میں بھڑک اٹھے، شیخ محمد عبدہ اس بغاوت کے خلاف تھے۔ کیونکہ تبدیلی اور اصلاح
 کا عمل ان کے نزدیک تبلیغ و تلقین اور افہام و تفہیم کے ذریعہ ہی کامیاب ہو سکتا تھا۔ لیکن
 آزادی اور شورایت سے متعلق ان کے خیالات ہر خاص و عام پر واضح تھے۔ اس لئے اس
 بغاوت کی ناکامی کے بعد اس میں ملوث دیگر حضرات کے ساتھ انہیں بھی تین سال کے
 لیے جلا وطن کر دیا گیا، چنانچہ وہ سب سے پہلے شام پہنچے جہاں ایک سال تک قیام کیا اس کے
 بعد ۱۸۸۳ء میں ان کے استاد جمال الدین افغانی نے انہیں پیرس بلا لیا۔ وہاں کل دس ماہ تک
 قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے یورپ کے بعض ممالک کا سفر کیا اور کئی دوسرے مفید کام

انجام دئے لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ مجلہ ”العروة الوثقی“ کا اجراء تھا (۱۶)۔ اس کا خاکہ جمال الدین افغانی نے تیار کیا تھا اور وہی اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ لیکن محمد عبدہ کی شرکت اور معاونت کے بغیر اس کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔ افغانی اور عبدہ نے اپنے مقالات کے ذریعہ عالم اسلام کو متحد کرنے، اہل مشرق کو استعماری طاقتوں کے عزائم سے آگاہ کرنے اور انہیں غلامی کی لعنت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے شوق و رغبت دلائی (۱۷)۔ ان مقالات کی وجہ سے ”العروة الوثقی“ کی مقبولیت بہت تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے منصوبہ بند طریقے سے اس کی اشاعت میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کیں، چار و ناچار اسے آٹھ ماہ کے اندر اٹھارہ شماروں کی اشاعت کے بعد ۱۸۸۴ء میں بند کرنا پڑا۔ (۱۸)

”العروة الوثقی“ کی اشاعت رک جانے کے بعد جمال الدین افغانی ایران چلے گئے اور محمد عبدہ نے بیروت کا قصد کیا یہاں انہوں نے سیاست اور حکومت کے مسائل کے بجائے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کو ترجیح دی۔ چنانچہ نبج البلاغہ اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی کی شرح لکھی، جمال الدین افغانی کے رسالہ ”الرد علی الدھرین“ کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا، منطق سے متعلق ایک کتاب ”شرح البصائر النصیریة“ اور ”رسالة التوحید“ بھی اسی دور جلاوطنی کی یادگار ہیں۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ وہ درس و تبلیغ کا کام بھی کرتے رہے چنانچہ بیروت کی ایک مسجد میں ہر ہفتہ درس قرآن دیتے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں انہیں مدرسہ سلطانیہ میں عربی زبان اور دینیات کی تعلیم کے لئے مدعو کیا گیا۔ انہوں نے اس دعوت کو بخوشی قبول کر لیا۔ اس مدرسہ میں انہوں نے روایتی درس و تدریس سے آگے بڑھ کر نصاب تعلیم میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی نشاندہی کی (۱۹)۔

شیخ محمد عبدہ کو کل تین سال کے لئے جلاوطن کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے عملاً چھ سال تک جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ اس کی وجہ مصر کے حکمران توفیق پاشا کی ان سے ناراضگی اور مخالفت تھی لیکن وزیراعظم ریاض پاشا کی کوشش ایک بار پھر کام آئی اور انہیں وطن واپسی کی اجازت مل گئی۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مصر واپس آئے۔ (۲۰) لیکن اس دفعہ انہیں تدریس کی ذمہ داری نہیں دی گئی بلکہ ضلعی عدالت کا قاضی بنا دیا گیا کیونکہ حکومت کو امید تھی کہ وہ قضا کے معاملات میں الجھ کر اپنا اصلاحی پروگرام جاری نہیں رکھ سکیں گے، کچھ عرصہ بعد انہیں محکمہ

الاستیناف (Court of appeal) کا رکن نامزد کیا گیا۔ (۲۱) قضاة ہونے کے بعد انہیں فرانسیسی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ مصری قاضی اپنے فیصلوں میں فرانسیسی قوانین کا بکثرت حوالہ دیتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر چالیس سال کی تھی لیکن انہوں نے بہت کم عرصہ میں فرانسیسی زبان بقدر ضرورت سیکھ لی۔ بعد میں ان کے مقالات اور تصانیف میں فرانسیسی زبان سے استفادہ کی مقدار بہت زیادہ بڑھ گئی، انہوں نے فرانسیسی مفکر اسپینسر کی کتاب کا ”التربیۃ“ کے نام سے عربی میں ترجمہ بھی کیا (۲۲)

۱۸۹۲ء میں خدیو توفیق کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ خدیو عباس مصر کا بادشاہ ہوا۔ وہ ایک بہادر اور باعزم نوجوان تھا اور مصر کی ترقی کے لئے متفکر تھا۔ شیخ محمد عبدہ اور ان کے رفقاء کو اس سے کافی امیدیں بندھ گئیں تھیں۔ وہ اس سے قریب ہوئے اور اسکے سامنے ازہر، اوقاف اور شرعی عدالتوں کی اصلاح سے متعلق تجاویز رکھیں، خدیو نے ازہر سے متعلق ان کی اصلاحی تجاویز سے اتفاق کیا اور پہلی دفعہ جامعہ ازہر کی مجلس انتظامی تشکیل دی اور محمد عبدہ کو اس مجلس کا ایک ممبر بنایا۔ انہوں نے ازہر کی اصلاح کی بے انتہا کوشش کی لیکن وہاں کے روایت پسند علماء کی مخالفت کے باعث ان کو نمایاں کامیابی نہیں مل سکی۔ (۲۳)

۱۸۹۹ء کے اوائل میں حکومت مصر نے انہیں مصر کا مفتی اعظم مقرر کیا۔ اس سے دونوں کے وقار میں اضافہ ہوا۔ (۲۴) یہاں وہ فتویٰ نویسی پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے اثرات کو استعمال کر کے معاشرت، سیاست، زبان اور تعلیم سے متعلق اپنے اصلاحی مشن کو آگے بڑھایا۔ چونکہ وہ مزاجاً تقلید اور اندھی پیروی کے مخالف تھے اس لئے ان کا یہ رنگ ان کے فتاویٰ میں صاف طور سے نظر آتا ہے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ اسلام اور جدید عصری تقاضوں کی روشنی میں عوام کی مشکلات کا حل پیش کریں۔ (۲۵)

قضا اور افتاء جیسی اہم ذمہ داریوں پر ہوتے ہوئے بھی وہ ملک اور معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے دوسری سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۹۹ء میں انہیں ”مجلس شوری القوانین“ کا ممبر بنایا گیا۔ اس کے بعد ”مجلس الاوقاف الاعلیٰ“ کی ممبر شپ بھی انہیں عطا کی گئی۔ ان دونوں مجالس میں انہوں نے برابر شرکت کی اور ملک اور باشندگان ملک کے حق میں مناسب مشورے دئے، سرکاری اداروں کے علاوہ خالصہ عوامی اداروں میں بھی وہ بہت اہم

کر راد ادا کرتے تھے۔ ”الجمیعة الاسلامیة الخیریة“ کے اولین موسسین کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل تھا۔ اس انجمن کا مقصد غریب بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا اور اس میں انجمن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ”جمیعة احیاء الکتب العربیة القدیمة“ کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد قدیم عربی کتابوں کی نشرو اشاعت تھا۔ (۲۶)۔ انہوں نے عدالتی نظام کی اصلاح کا بھی بیڑہ اٹھایا۔ وہ ججوں کا فکری اور اخلاقی معیار بہت بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ اور ان کے فرائض و اختیارات میں وسعت اور استحکام کے خواہاں تھے۔ ان تمام ہمہ گیر مصروفیات کے ساتھ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شائع ہونے والے مستشرقین کے مقالات اور تصانیف کا جائزہ بھی لیتے رہتے تھے۔ اور ان کا جواب لکھتے تھے۔ ان کے بعض مقالات ”الاسلام و النصرانیة مع العلم و المدینة“ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مقالات کی جامعیت اور قوت استدلال کا اعتراف خود مستشرقین نے کیا ہے۔ (۲۷)

زندگی کے آخری لمحہ تک انہوں نے اپنا مشن جاری رکھا، خدیو اسماعیل کی خود پسندی اور مفاد پرستی کی وجہ سے شدید اختلافات بھی ہوئے۔ اور ایک وقت وہ بھی آجیب افتاء کی ذمہ داری سے استعفیٰ دیدیا لیکن مختلف کمیٹیوں اور انجمنوں سے وابستگی، اہم معاشرتی، سیاسی اور دینی مسائل پر مقالات کی تصنیف، تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم اور طرز تعلیم میں اصلاح کے لئے جدوجہد اور اسلام مخالف پروپگنڈوں کے منہ توڑ جواب دینے کا سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا اور اس وقت بھی جبکہ ڈاکٹروں نے ان کے مرض (کینسر) کی سنگینی سے انہیں مطلع کر دیا تھا، وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ بالآخر ۵۹ سال کی عمر میں ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کے انتقال پر مصر میں عوامی اور حکومتی سطح پر سوگ منایا گیا اور ان کی موت کو عالم اسلام کیلئے ایک عظیم نقصان قرار دیا گیا۔ (۲۸)

سرمایہ تفسیر

شیخ محمد عبدہ نے قرآن مجید کا درس بھی دیا اور اس کی تفسیر بھی لکھی۔ البتہ ان کے درس کا حصہ تفسیر کے بالمقابل زیادہ ہے۔ وہ مختلف وجوہ کی بنا پر تفسیر لکھنے کی ضرورت کے قائل نہیں تھے۔ ان کے شاگرد رشید رضا کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے استاد سے ملاقات کے بعد سب سے پہلی

تجويز قرآن مجيد كى تفسير لکھنے سے متعلق رکھی۔ ليکن انہوں نے یہ کہہ کر منع کر ديا کہ تفاسير كى تعداد يوں ہی بہت زيادہ ہے اور سب مل کر آيات قرآنى كى تشریح و توضیح كے ضرورى پہلوؤں كا احاطہ كرتى ہيں۔ تفسير لکھنے سے گريز كى دوسرى بڑى وجہ لوگوں ميں ذہنى و فكري استعداد كى كمى تھی۔ عموماً ان كے اندر اس طرح كى كتابوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے كى صلاحيت نہيں تھی۔ شيخ محمد عبدہ كہا كرتے تھے کہ مصرى كتب خانوں ميں كتابوں كى كمى نہيں بلکہ بيدار مغز، ذود فہم اور كثير المطالعہ افراد كى كمى ہے۔ (۲۹)

وہ تقرير اور درس قرآن كى اہميت اور اثر انگيزى كے معترف تھے۔ ايك مقرر اپنے مدعا كے اظہار كے لئے الفاظ كے علاوہ حرکات و سکنات سے بجن مدد ليتا ہے۔ اس كى نظر اپنے مخاطب پر مرکوز ہوتى ہے اور مخاطب بھى اس كى باتوں كو غور سے سنتا ہے اور حسب ضرورت مشتبہ اور مشكل امور كى مزيد وضاحت طلب كرتا ہے۔ اس طرح اخذ و استفادہ كا امكان تقرير اور درس كى شكل ميں زيادہ ہوتا ہے۔ (۳۰)

تقرير ہوا يا تحرير ہر دو ذرائع سے شيخ محمد عبدہ كا جو كچھ تفسيرى سرمايہ ہم تك منتقل ہوا ہے وہ مقدار ميں كم ہونے كے باوجود قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ اس كے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شيخ محمد عبدہ ذخيرہ تفسير ميں كسى اضافہ كے بجائے لوگوں كو قرآن مجيد كے اصل پيغام اور اس كى حقيقى روح سے روشناس كرانا چاہتے تھے۔ اسى لئے آخرى عمر كے درس قرآن كے علاوہ انہوں نے كبھى بھى قرآن مجيد كى سورتوں كا على الترتيب از اول تا آخر درس كا ارادہ نہيں كيا۔ بلکہ وہ ايك موضوع كا انتخاب كرتے تھے۔ اور اس سے متعلق قرآنى آيات كو يکجا كر كے ان كى روشنى ميں گفتگو كرتے تھے۔ انہوں نے تفسير قرآن كے موضوع پر جو كچھ لکھا ہے اسكى كسى قدر تفصيل درج ذيل ہے۔

۱۔ تفسير پارہ عم (۳۱) :- اسے انہوں نے ”الجمعية الخيرية الاسلامية مصر“ كے ارکان كے مشورہ سے لکھا تھا۔ تا کہ یہ جمعيت كے زير اہتمام قائم مدارس كے اساتذہ كم لئے ماخذ اور مرجع كے طور پر استعمال ہو سکے اور وہ اس كى مدد سے اپنے طلبہ كو اس پارہ كى سورتوں كے مطالب سے آگاہ كريں۔ یہ ايك مختصر تفسير ہے۔ اس كى زبان آسان اور صاف ستھرى ہے۔ اس ميں مفسرين كے اختلافات اور نحو و لغت كے پيچيدہ مباحث سے بالكل تعرض نہيں كيا گيا ہے۔ (۳۲)

۲۔ تفسیر سورہ العصر:۔ شیخ محمد عبدہ نے ۱۹۰۲ء میں بلاد مغرب کا سفر کیا تھا اس وقت انہوں نے الجزائر کے علماء اور مفکرین کی منتخب جماعت کے سامنے اس سورہ کے مطالب بیان کئے تھے، یہ ایک طویل تفسیر ہے اور کل سات دنوں میں لکچرس کی شکل میں پیش کی گئی تھی۔ (۳۳)

۳۔ دروس من القرآن الکریم:۔ یہ ان دروس قرآن کا مجموعہ ہے جو شیخ محمد عبدہ نے بیروت اور قاہرہ کی مساجد میں مختلف مواقع پر پیش کئے تھے، اس میں قرآن مجید کی ایک آیت یا کئی آیات کو منتخب کر کے ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ اور ان کی روشنی میں مسلمانوں کو ان پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی قرآن کی عظمت اور اسلام کی حقانیت کا اثبات کیا گیا ہے۔ (۳۴)

۴۔ تفسیر ”المنار“ از ابتدا تا سورہ النساء آیت نمبر ۱۲۶:۔ یہ ان دروس کی تحریری شکل ہے جو شیخ محمد عبدہ نے اپنے احباب اور مریدین کے سامنے جامعہ ازہر میں دئے تھے۔ شیخ اس کے لئے تیار نہیں تھے لیکن محمد رشید رضا کے اصرار اور شدید خواہش پر آمادہ ہو گئے تھے۔ یہ سلسلہ درس محرم ۱۳۱۷ھ سے محرم ۱۳۲۳ھ تک کل چھ سال جاری رہا۔ محمد رشید رضا کا معمول تھا کہ وہ اپنے استاد کے درس کی اہم باتیں نوٹ کر لیتے تھے۔ پھر بعد میں فراغت کے وقت اپنی یادداشت پر اعتماد کر کے مزید تفصیلات یکجا کر لیتے تھے۔ یہ دروس بعد میں افادہ عام کی غرض سے مجلہ ”المنار“ کے صفحات پر شائع ہونے لگے۔ لیکن اشاعت سے پہلے شیخ محمد عبدہ کے سامنے نظر ثانی کے لئے پیش کئے جاتے تھے۔ وہ حسب ضرورت اس میں حذف و اضافہ بھی کرتے تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تھے اور خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ (۳۵)

طریقہ درس و تفسیر

قرآن مجید کی آیات کا درس ہو یا ان کی کتابت، شیخ محمد عبدہ ان دونوں میں ایک متعین نہج اور طریقہ کار کے پابند تھے، اس سلسلے میں سب سے اہم اصول قرآن مجید پر براہ راست غور و فکر اور اس سے اخذ و استفادہ تھا، وہ اس خیال سے کہ مبادا کسی مفسر کی رائے سے متاثر نہ ہوں، بالعموم کسی تفسیر سے رجوع نہیں کرتے تھے، ہاں اگر عربی زبان یا اعراب سے متعلق کوئی

پیچیدہ بحث ہوتا تھا تو بقدر ضرورت کسی تفسیر سے مراجعت کر لیتے تھے۔ اپنے اصول کی صراحت شیخ محمد عبدو نے خود کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

” لانی لا اطالع قبل ان اقرا لکننی ربما اتصفح کتاب تفسیر
اذا کان هناك وجه غریب فی الاعراب او نکتة غریبة فی اللغة “

(۳۶)

(میں درس دینے سے پہلے کسی تفسیری کتاب کا مطالعہ نہیں کرتا ہوں البتہ جب کبھی اعراب یا زبان سے متعلق کوئی عجیب و غریب شکل سامنے آجاتی ہے تو کسی تفسیر کی کتاب کی ورق گردانی کر لیتا ہوں۔)

آیات کی تشریح و توضیح میں وہ اصلاً اپنی عقل پر اعتماد کرتے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ اگر عقل کا صحیح استعمال کیا جائے تو مطالب تک رسائی کے لئے اس سے بہتر اور موثر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ (۳۷)۔ چنانچہ وہ آیات کی تلاوت کے بعد قرآن مجید کے استعمالات اور زبان و بلاغت کے اصولوں کی روشنی میں ان کے معانی کا تعین کرتے تھے۔ وہ اس امر کا پورا اہتمام کرتے تھے کہ ان کی تشریحات جدید انسان کے فکری معیار سے متصادم نہ ہوں۔

اظہار اور تعبیر کے باب میں بھی ان کا ایک منفرد طریقہ کار تھا۔ وہ ان مقامات پر قدرے تفصیل اور وضاحت سے کام لیتے تھے جہاں بالعموم مفسرین نے غفلت اور کوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے اور ان مسائل کے سلسلے میں انتہائی مختصر گفتگو کرتے تھے جو مفسرین کی دلچسپیوں کے اصل مرکز تھے جیسے لغت، اعراب اور بلاغت کے مباحث یا قصص و حکایات اور تاریخی اشخاص و مقامات وغیرہ کی تفصیلات۔ (۳۸)

تحریر یا تقریر سے قبل وہ اپنے سامعین یا مخاطبین کے ذہن و مزاج کا بخوبی اندازہ کر لیتے تھے۔ اگر ماحول سازگار ہوتا اور لوگ اخذ و استفادہ کے لئے آمادہ ہوتے تو وہ کتاب اللہ کے مطالب بیان کرتے، بصورت دیگر اجتناب کی راہ اختیار کرتے، دوران درس بھی وہ اپنے اس اصول کا پاس رکھتے تھے، چنانچہ اگر وہ محسوس کر لیتے کہ مجلس میں کم فہم یا کند ذہن لوگوں کی اکثریت ہے اور وہ سننے سمجھنے کی مطلوبہ صلاحیت سے عاری ہیں تو وہ اپنے درس میں حد درجہ اختصار سے کام لیتے۔ اس کے برعکس اگر مجلس میں توجہ اور انہماک

سے سننے کا ماحول ہوتا اور لوگوں کی ذہنی و فکری سطح بلند نظر آتی تو وہ قرآن پاک کے اسرار و رموز کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے۔ (۳۹) مکمل تفسیر قرآن لکھنے سے اجتناب کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مصر میں پڑھنے لکھنے کے شوقین اور غور و فکر کرنے کے عادی اشخاص کی حد درجہ کمی پاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں کے سامنے آیات قرآن کی تفسیر سے اس کتاب کی عظمت اور وقار کو نقصان پہنچے گا۔

مشہور مصری مفکر ڈاکٹر احمد امین نے شیخ محمد عبدو کے طریقہ تفسیر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہیں جب کسی عقیدہ سے متعلق آیت کی تشریح کرنی ہوتی تو سب سے پہلے وہ قرآن مجید کی ان آیات کا حوالہ دیتے جہاں اس عقیدہ کا تذکرہ ہوتا۔ ان سب کی مدد سے وہ اس عقیدے کے بنیادی خدو خال واضح کرتے۔ پھر مسلم معاشرہ میں اس عقیدے کے تعلق سے جو فساد آیا ہے اس کی وضاحت کرتے اور اس فساد کے تدارک کی شکلیں بتاتے۔ اسی طرح اگر اخلاقیات یا معاشرت سے متعلق کوئی آیت ہوتی تو سب سے پہلے وہ اخلاقیات کی اہمیت واضح کرتے۔ پھر قوموں کے عروج و زوال اور صلاح و فساد میں ان کے کلیدی کردار کی تفصیلات بیان کرتے۔ معاشرتی مسائل کے تذکرہ میں وہ انتہائی خوش اسلوبی سے اقوام عالم اور مسلم ممالک کی صورت حال کا جائزہ لے لیتے اور ان کی بہتری اور اچھائی کے تعلق سے انتہائی مفید مشورے دیتے۔ اس طرح ان کی تفسیر کو عملی یا اخلاقی تفسیر کہا جاسکتا ہے۔ ان کی تفسیر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں تقویٰ، خدا ترسی اور روحانیت کے اعلیٰ معیار کی وضاحت کی گئی ہے اور نفس انسانی کو ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے شوق و رغبت دلائی گئی ہے۔ اس معنی میں ہم اسے روحانی تفسیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ (۴۰)

فہم قرآن کی ضرورت و اہمیت

فہم قرآن کی ضرورت و اہمیت کے سلسلہ میں انہوں نے تفسیر المنار کے مقدمہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا خلاصہ ذیل کی سطروں میں پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید ایک ایسی کتاب سے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے نازل فرمایا ہے۔ اس میں انسان کو اس کی تخلیق کی غرض و غایت، کائنات کے اندر اس کے مقام و مرتبہ اور اس کے حدود و اختیارات سے آگاہ کیا گیا ہے اور اس کی تعلیمات کے مطابق

زندگی بسر کرنے کی شکل میں اسے دنیا و آخرت کی سعادت اور فلاح کی ضمانت دی گئی ہے۔
 قرآن اول کے مسلمانوں نے قرآن مجید کے اس پیغام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔
 چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید ان کے شامل حال ہوئی اور وہ اس دنیا کے ایک بڑے حصے پر
 غالب ہو گئے۔ ان کی عظیم فتوحات کا واحد سبب ایمان و یقین، صبر و استقامت اور عزم و
 حوصلہ پر مبنی وہ قوت و طاقت تھی جو قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ سے انہیں حاصل ہوئی
 تھی۔ دراصل قرآن مجید تمام قوتوں کا منبع اور تمام علوم و فنون کا ماخذ ہے، یہ ایک ایسا نسخہ کیمیا
 ہے جو انسان کے دلوں میں خالق حقیقی سے عشق و محبت کا رس گھول دیتا ہے اور معبودان باطل
 سے حد درجہ نفرت کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ (۴۱)

ان سب تفصیلات کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دور حاضر کے مسلمان قرآن مجید
 کی قدر و منزلت سے آگاہ ہوں۔ آج ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس عظیم کتاب کے فہم سے
 عاری ہیں۔ وہ قرآن کے الفاظ اپنی زبانوں سے ادا کر لیتے ہیں لیکن ان کی روح ان کے قلب
 و جگر کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ وہ اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہیں لیکن ان کی زندگیاں
 ان کے اثرات سے خالی ہیں۔ انہوں نے قرآن کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ اسلام اور
 اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قسموں میں خدا، رسول اور قرآن کا بے دریغ حوالہ
 دیتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ دراصل قرآن انہیں ورثے میں ملا
 ہے۔ انہوں نے کبھی اس کے مطالب پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اس کی تعظیم و تکریم
 کے ظاہری آداب بجا لاتے ہیں۔ اسے طاقتوں میں سجاتے ہیں۔ حریر و ریشم کے جزدان میں
 رکھتے ہیں۔ امراض اور مصیبتوں سے نجات کے لئے اس کی تعویذ بھی بناتے ہیں اور ارواح خبیثہ
 سے نجات کیلئے اس کی آیت لکھ کر اپنے گھروں میں آویزاں کرتے ہیں۔ کاش کہ انہیں معلوم
 ہوتا کہ عقیدت و محبت کے ان مظاہر سے قرآن کی تکریم میں اضافہ کئے بجائے اس کی شان
 میں گستاخی ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہمارے قراء حضرات کا یہ حال ہے کہ وہ مخارج کی ادائیگی
 اور آواز کے حسن پر پوری توجہ صرف کئے ہوئے ہیں اور فہم کے لئے ان کے پاس کوئی وقت
 نہیں۔ اسی لئے آج کی جاہلیت دور اول کی جاہلیت سے زیادہ سنگین معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس
 زمانے میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو قرآن کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ (۴۲)

(يعرفونه كما يعرفون ابنائهم)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید کا سمجھنا اور اس سے ہدایت حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے کیونکہ قرآن مجید کے نزول کی غرض و غایت فہم کلام کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قرآن کی تعلیمات اور شریعت اسلامی کی مصالحو سے واقفیت اور انسانی زندگی پر ان کی اثر انگیزی بھی فہم قرآن پر موقوف ہے۔ مسلمانوں کے فکر و عمل کا استحکام اور دوام بھی اسی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ ہر زمانے اور ہر دور میں فہم قرآن کی ضرورت و اہمیت پر متفق رہی ہے۔ اور عہد رسالت کا ہر مسلمان واقعہً اس قرآن کو سمجھتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ (۴۳)

فہم قرآن کے لزوم کی جو بات اوپر کہی گئی ہے اس سے مراد قرآن کا ایسا فہم ہے جس سے انسان اپنے رب کی پسند و ناپسند اور اپنے فرائض اور حدود و اختیارات سے آگاہ ہو جائے۔ ظاہر ہے اس طرح کا فہم ہر اس انسان سے ممکن ہے جو عربی زبان سے واقف ہو گا۔ اس کے لئے اسے بہت زیادہ محنت اور مشقت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ یہی وہ فہم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر خاص و عام کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ (۴۴)۔ ”ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر“

تفسیر کا مطلوبہ معیار

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ یہ انسانیت کے لئے خدا کا آخری ہدایت نامہ اور مکمل نظام حیات ہے۔ اور انسانوں کی دنیوی و اخروی فلاح و کامرانی کا ضامن ہے۔ قرآن سے متعلق مذکورہ بالا حقائق سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے عقل و خرد کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی تفسیر کی جو کاوش بھی کی جائے اس میں مذکورہ امور کی پوری رعایت کی جائے اور ان سے انحراف نہ کیا جائے۔ شیخ محمد عبدہ کی نظر میں تفسیر کا مطلوبہ معیار یہی تھا۔ یعنی یہ کہ کتاب اللہ کو کتاب رشد و ہدایت تسلیم کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے اور اسکے مطالب کی تشریح و توضیح میں اس کی اس امتیازی شان کو ملحوظ رکھا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:-

التفسیر الذی نطلبہ ہو فہم الكتاب من حیث ہو دین یرشد الناس

إلی ما فیہ سعادتہم فی حیاتہم الدنیا و حیاتہم الآخرة فان هذا هو

المقصد الاعلیٰ منه و ما وراء هذا من المباحث تابع له و داء؟ او
وسيلة لتحصيله. (۳۵)

”ہم جس طرح کی تفسیر چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کو اس طرح سمجھا جائے کہ دراصل وہ ایک ایسا دین ہے جو لوگوں کو دنیوی اور اخروی سعادت سے ہمکنار کرنے والا ہے۔ کیونکہ یہی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد ہے۔ اس کے علاوہ جتنے مباحث ہیں ان کی حیثیت مذکورہ مقصد کی تحصیل کے ذریعے کی ہے یا وہ اسی کے تابع ہیں“

تفسیر المنار کے مقدمہ میں علامہ رشید رضا نے بہت تفصیل سے اپنے استاذ کے خیالات کی وضاحت کی ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ قدیم زمانے سے لیکر اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک میں چند متعین مقاصد پیش نظر رہے ہیں اور انہی کی تفصیل و تشریح پر ان کی مولفین کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر و بیشتر تفاسیر میں قرآن مجید کے اصل پیغام پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ان میں ایسے مباحث کی کثرت ہے جو لوگوں کو کتاب کے اصل مقصد سے غافل کر دیتے ہیں اور انہیں غیر مفید باتوں میں الجھا دیتے ہیں۔ اسی لئے محمد عبدہ بار بار تاکید کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کو اللہ رب العالمین کی طرف سے ہدایت کی کتاب سمجھتے ہیں اور اسکی تعلیمات پر عمل کو انسانوں کی دنیوی و اخروی سعادت کا باعث تسلیم کرتے ہیں اور یہ کہ وہ قرآن کی جو تفسیر بھی لکھتے ہیں اس میں قرآن مجید کا یہ وصف ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ (۳۶)

شیخ محمد عبدہ نے قدیم کتب تفسیر کا مطالعہ کیا تھا ان کے سامنے تمام مفسرین کے مناجح تفسیر واضح تھے۔ وہ چاہتے تو ان کی اتباع کرتے ہوئے ان ہی کے طرز کی ایک اور تفسیر لکھ ڈالتے۔ یا کم از کم ان کی مدد سے ایک نئی چیز ترتیب دے دیتے لیکن ان کے یہاں تو تفسیر کا مطلب ہی کچھ اور تھا۔ اس کے بغیر تفسیر بے معنی اور سعی لا حاصل تھی۔ وہ لکھتے ہیں:-

”عصر حاضر میں اور اس سے صدیوں پہلے سے تفسیر کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ مفسرین کے اقوال سے واقفیت حاصل کی جائے حالانکہ ان کے اقوال میں اس قدر اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے کہ وہ قرآن کی شان سے

بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔ اے کاش کہ اقوال مفسرین کے یہ طالبین اپنی عقل و فہم سے کام لے کر قرآنی الفاظ کے معانی معلوم کرتے اور ان کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ صرف اس بات کے خواہاں ہیں کہ دوسروں پر اپنی علیت کا رعب جمانے اور بحث و مباحثہ میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے مفسرین کے زیادہ سے زیادہ اقوال جمع کر دیں اور انہیں یاد کر لیں۔ پھر اعراب اور تاویل سے متعلق نادر اور عجیب و غریب شکلیں پیش کریں جنکا مقاصد نزول قرآن سے کوئی سروکار نہ ہو“ (۴۷)

شیخ محمد عبدہ نے تفسیر کے بارے میں اپنے مرکزی نظریے کے اظہار اور عام مفسرین کی روش پر تنقید کے علاوہ تفسیر سے متعلق ایک ہمہ گیر خاکہ بھی پیش کیا تھا۔ انہوں نے اپنے عمیق مطالعہ اور کشادہ ذہن سے کام لے کر کسی تفسیر کی عمدگی اور کامیابی کے لئے پانچ شرطوں کی موجودگی ضروری قرار دی ہے۔ ان میں سے پہلی شرط قرآن مجید میں مستعمل مفرد الفاظ کی تحقیق اور ان کی کنہ و حقیقت کا ادراک ہے۔ یہ ملکہ کلام عرب کے مطالعہ اور اہل لغت کی تصریحات سے آگہی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ دوسری شرط اسالیب زبان سے واقفیت ہے۔ یہ صلاحیت بھی فصیح و بلیغ کلام کے مطالعہ اور مشق و ممارست سے پیدا ہوگی۔ تیسری شرط قوموں اور اشخاص کے احوال و ظروف کا علم ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مختلف مقاصد کے تحت تاریخ انسانی کی بعض اقوام اور اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے ان قوموں اور افراد کے عروج و زوال اور اقبال و ادبار میں کار فرما قوانین فطرت اور سنت الہی سے واقفیت ہوتی ہے۔ اس لئے ایک مفسر کو تاریخ عالم اور انسانی نفسیات سے باخبر ہونا چاہیے۔ چوتھی شرط عہد جاہلیت اور عہد رسالت پر گہری نظر ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے کفر و شرک کی آلودگیوں میں ملوث انسانیت کو ایمان و عقیدہ کی کتنی عظیم نعمت سے ہمکنار کیا۔ اور اس کتاب کی تعلیمات نے لوگوں کی زندگیوں میں کس قدر بڑا انقلاب برپا کیا۔ پانچویں شرط نبی کریم اور ان کے اصحاب کی سیرت کا مطالعہ ہے کیونکہ اس سے قرآن کے افکار کی عملی تعبیر دیکھنے کا موقع ملے گا اور اس حقیقت پر یقین اور

زیادہ پختہ ہو گا کہ قرآن انسانی قلوب کی تطہیر اور ان کا تزکیہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ (۴۸)
 مذکورہ بالا پھراحتوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ محمد عبدہ کی نظر میں
 قرآن مجید کی حقیقی تفسیر وہ ہے جس میں مفسر قرآن پاک کے مقصد نزول کو اساسی اہمیت
 دے۔ پھر قرآن کے استعمالات اور اپنے ذوق و وجدان کی روشنی میں وہ آیات کے مطالب بیان
 کرے۔ اور اپنی تشریحات میں اس امر کا اہتمام کرے کہ ان سے انسان کو روحانی مسرت
 حاصل ہو اور وہ عمل و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو۔ اس طرح کی تفسیر میں نحو و بلاغت کے
 مسائل انتہائی اختصار کے ساتھ اور بقدر ضرورت زیر بحث آئیں گے اور اس حد تک ہونگے
 کہ قرآن کے پیغام کے لئے حجاب نہ بنیں۔ اس میں اصل اہمیت غور و فکر اور فہم و تدبر کو
 حاصل ہوگی اور تقلید و اتباع کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ (۴۹)

سورتوں کی موضوعاتی وحدت

جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے کہ شیخ محمد عبدہ کے نزدیک تفسیر قرآن کا سب سے اہم
 ماخذ خود قرآن کریم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی تنزیل کی طرح اس کے مطالب اور
 مفہم کی وضاحت بھی اپنے ذمہ لی ہے، چنانچہ اگر پورے قرآن کو غور سے پڑھا جائے اور اس
 میں مذکورہ حقائق کو اس کے اپنے بیانات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو مشکلات
 فہم قرآن پر باسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔ ”قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعہ ہو“ اس اصول
 کے انطباق کے کئی ایک پہلو ہیں (۵۰)۔ ان ہی میں سے ایک موضوعاتی وحدت بھی ہے
 کیونکہ اگر کسی سورہ کا کوئی موضوع متعین کر لیا جائے تو اس کی روشنی میں سورہ کی آیات کو
 سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

شیخ محمد عبدہ قرآن مجید کو ایک منظم اور مربوط کلام مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں قرآن حکیم
 کے تمام اجزاء اس کے اساسی مقاصد نزول سے ہم آہنگ ہیں اور ان کے مابین کوئی اختلاف یا
 تضاد نہیں ہے۔ (۵۱) قرآن مجید کی ہر سورہ اس کے مقاصد نزول میں سے کسی ایک کی زیادہ
 تفصیل سے وضاحت کرتی ہے جبکہ اس میں دیگر مقاصد کا تذکرہ ضمنی ہوتا ہے۔ سورتوں کے
 اس اختصاص و امتیاز کو ہم دوسرے الفاظ میں مرکزی موضوع کہتے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں سورتوں کے مرکزی موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی

ہے۔ اسی لئے آیات کی تشریح کے دوران جگہ جگہ مرکزی موضوع کا حوالہ دیا ہے۔ ان کا یہ انداز تفسیر پارہ عم میں خاص طور سے نمایاں ہے جہاں اکثر و بیشتر سورتوں کی تفسیر سے پہلے ان کے موضوع کی نشاندہی کی ہے۔ پھر دوران تفسیر آیات کے ان کے مرکزی موضوع سے ربط کی وضاحت کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے کبھی کبھی دو یا تین سورتوں کے درمیان بھی موضوعاتی ربط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سورہ الانقطار کے شروع میں انہوں نے ”سورہ الستکویر“ سے موضوعاتی تعلق کی نشاندہی کی ہے۔ (۵۲)

انہوں نے سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر میں اور زیادہ کے وضاحت کے ساتھ اپنی فکر کو پیش کیا ہے۔ وہ تفسیر سورہ ”الفاتحہ“ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

” ان الفاتحة قد اشتملت اجمالا على الاصول التي يفصلها القرآن تفصيلا فكان انزالها اول موافقا لسنة الله تعالى في الابداع و على هذا تكون الفاتحة جديرة بان تسمى ام الكتاب “ (۵۳)

”بلاشبہ سورہ فاتحہ ان اصولوں پر مشتمل ہے جن کی پورے قرآن میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس طرح سورہ فاتحہ کا پہلے نازل کیا جانا اللہ تعالیٰ کے قانون تخلیق کے عین مطابق ہے اور اسی وجہ سے سورہ فاتحہ اس بات کی مستحق ہے کہ اسے ام الكتاب کہا جائے۔“

تفسیر سورہ فاتحہ کے مقدمہ میں انہوں نے ان اصولوں اور مقاصد کی صراحت بھی کی ہے جو ان کے نزدیک پورے قرآن مجید میں اساسی اور مرکزی نوعیت کے ہیں۔ اور جن کا انتہائی مجمل تذکرہ سورہ الفاتحہ میں ہے۔ وہ بنیادی مقاصد کل پانچ ہیں۔

(۱) توحید (۲) انذار و تبشیر (۳) عبادات (۴) سعادت (۵) قصص و حکایات۔ (۵۴)

اسی طرح سورہ البقرہ کے آغاز میں بھی انہوں نے اس کے مشتملات کی وضاحت کی ہے۔ جو ان کی نظر میں اسلام کی طرف دعوت اور عقائد و عبادات اور احکام شریعت کی تفصیلات کا احاطہ کرتی ہے۔ (۵۵) موضوع کے تعین کے بعد اس سورہ کی تمام آیات کا اس سے ربط و تعلق ثابت کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ انہوں نے یہ کام بھی انتہائی اہتمام کے ساتھ انجام دیا۔ چنانچہ سورہ البقرہ کی تفسیر کے دوران جگہ جگہ اس کے مرکزی موضوع کا تذکرہ ملتا ہے۔

الغرض شیخ محمد عبدہ سورتوں کی موضوعاتی وحدت کو ایک مسلم حقیقت اور فہم قرآن کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انھیں ان مفسرین پر سخت حیرت ہے جنہوں نے غور فکر کی کمی کے باعث آیات کے مابین ربط و تعلق اور سورہ کے مرکزی موضوع پر مشتمل ہونے کا انکار کر دیا۔ اسکی وجہ انکی نظر میں مفسرین کرام کا شان نزول سے متعلق روایات پر حد سے زیادہ اعتماد و انحصار ہے۔ یہ روایات سورتوں کی آیات کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہیں اور انھیں ایک دوسرے کیساتھ ملا کر پڑھنے اور غور و فکر کرنے سے ایک مفسر کو روک دیتی ہیں۔ بلاشبہ یہ روایات قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے منافی ہیں اور فہم قرآن کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس لئے ان سے اجتناب لازم ہے (۵۶)

قرآن مجید: عقائد و افکار کا اصل مرجع:

”تفسیر القرآن بالقرآن“ کے اصول کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اسکی مدد سے مفسر کو صحیح عقائد تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین میں سے کچھ لوگوں نے اس اصول کو نظر انداز کر دینے کے سبب سخت قسم کی فکری و اعتقادی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کچھ فرقوں اور دینی گروہوں نے یہ جرأت بھی کی کہ اپنے مفروضہ خیالات کی تائید میں قرآنی آیات اور الفاظ کی من مانی تاویلیں کیں۔ جن کے باعث صحیح دینی معتقدات انکی نظروں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو گئے۔ شیخ محمد عبدہ امت مسلمہ کی فکری تاریخ کے اس سقم اور اس کے اسباب سے واقف تھے۔ وہ ایک دینی مصلح تھے۔ اس لئے انھوں نے اس فکری کجروی کی اصلاح پر خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے زیادہ زور قرآن کی اس حیثیت کے اثبات پر صرف کیا کہ وہی اصل معیار و میزان ہے، اس پر رکھ کر عقائد کی صحت و صداقت اور قدرو قیمت کا اندازہ کیا جانا چاہئے۔ اور اسے مصدر و ماخذ تسلیم کر کے افکار و خیالات کا اخذ و استنباط کیا جانا چاہئے۔ اپنی اس فکری وضاحت وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

” ارید ان یکون القرآن اصلاً تحمل علیہ المذاهب والآراء فی

الدین لا ان تكون المذاهب اصلاً والقرآن هو الذی یحمل علیہا

ویرجع بالتأویل والتجریف الیہا کما جرى علیہ المنخلون وتاہ

فیہ الضالون (۵۷)

میں یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کو اصل اور مرجع کی حیثیت حاصل ہو اور مذہبی و مسلکی افکار و خیالات اس سے مستنبط اور اس پر محمول ہوں۔ یہ ہرگز نہ ہو کہ مذاہب و مسالک کو اصل قرار دے کر قرآنی مندرجات میں تحریف و تاویل کے ذریعہ ان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ یہ گمراہ لوگوں کا طریقہ کار ہے۔

انہوں نے اپنے اس نظریے کی وضاحت کے لئے ان مفسرین پر سخت تنقید کی ہے جو مخصوص عقائد و افکار کی عینک سے قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں قرآنی مضامین کو اپنے عقائد کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشہور مصری مفکر ڈاکٹر عثمان امین نے لکھا ہے کہ

”شیخ سب سے زیادہ ان مفسرین پر ناراض تھے جنہوں نے اپنی تفسیروں میں قرآنی الفاظ سے کھیلواڑ کیا اور اس سے عجیب و غریب معانی مستنبط کئے۔ اس لئے وہ قرآن کی تفسیر میں عقل کی کار فرمائی کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جب بھی کوئی مشتبہ نص ہمارے سامنے آئے تو سب سے بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے ہم اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں اور اس کے صحیح علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ہم اس کی ایسی تاویل کریں جو مقبول عام قرائن کے مطابق، اسلام کی روح سے ہم آہنگ اور عربی زبان و قواعد کے موافق ہو“ (۵۸)

”شیخ محمد عبدہ اس حقیقت پر کامل یقین رکھتے تھے کہ وہ افکار و خیالات جن کی بنیاد ظن و تخمین اور وہم و گمان پر ہوتی ہے اور جو قرائن سے ماخوذ نہیں ہوتے وہ اس قابل نہیں کہ ان پر توجہ دی جائے۔ عقل سلیم بھی ان سے ابا کرتی ہے۔ کیونکہ دین کا عقل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اور یہ دونوں اوہام و خرافات کو قبول نہیں کرتے۔“ (۵۹)

عقل و فکر کا استعمال اور تقلید و اتباع سے اجتناب

شیخ محمد عبدہ کے نزدیک تفسیر قرآن میں انسانی عقل و فہم کا استعمال اور شعور و وجدان کی رعایت ناگزیر ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں قرآن حکیم کی غایت اولیٰ اور اس کے نزول کے اساسی مقصد کی وضاحت کے ساتھ ساتھ تدبر و تفکر اور اجتہاد و استدلال کی ضرورت و اہمیت

کو ابھار کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل وہ خود ایک عظیم مفکر اور مدبر تھے اور حریت فکر و اظہار رائے کو انکے اصلاحی و تجدیدی مشن میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ (۶۰)۔ ازہری علماء میں وہ تنہا شخص تھے جنہوں نے جامعہ ازہر میں تجدید، تعقل اور اجتہاد کا علم بلند کیا اور حریت فکر و نظر کا دفاع کیا۔ اس کے نتیجے میں روایت پسند حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی لیکن علم و مشاہدہ پر مبنی اور کتاب و سنت سے ماخوذ فکر میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ظاہر ہے ان کے ان افکار سے ان کی تفسیر کا متاثر ہونا لازمی امر تھا، چنانچہ تفسیر المنار کے مقدمہ میں وہ قرآن عزیز کی فہم صحیح پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اعنی بالفہم ما یكون عن ذوق سلیم تصیبه اسالیب القرآن
بعجائبها و تملکھ موعظہ فتشغلہ عما بین یدیه مما سواہ . لا ارید
الفہم الماخوذ بالتسلیم الاعمی من الکتب اخذا جافالم یصحہ
ذلک الذوق و ما یتبعہ من رقة الشعور و لطف الوجدان الذین
ہما مدار العقل و التأثير و الفہم و التدبر.“ (۶۱)

فہم قرآن سے میری مراد وہ فہم ہے جو ذوق سلیم سے عبارت ہو جس پر قرآن مجید اپنے اسالیب کی تمام تر ندرتوں کے ساتھ اثر انداز ہو اور جس پر اس کی حکمت و موعظت کے عناصر کا غلبہ ہو اور اس کے نتیجے میں آدمی اپنے گرد و پیش سے غافل ہو کر قرآن میں گم ہو جائے۔ میں ایسی فہم ہرگز مراد نہیں لیتا جو تفسیر کی کتابوں کی اندھی تقلید اور بے جان استفادہ پر مبنی ہو۔ اور جس میں ذوق سلیم، احساس لطیف اور وجدان نفس کا کوئی دخل نہ ہو۔ حالانکہ فہم و تدبر اور تاثیر و تفہیم کا انحصار ان ہی ساری باتوں پر ہے۔

مذکورہ اقتباس میں عقل کے ساتھ ذوق و وجدان سے مطابقت بھی فہم صحیح کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے۔ کیونکہ شیخ محمد عبدہ کا یہ خیال ہے کہ قرآن مجید کی دعوت نے جس طرح انسان کی عقل و شعور کو مطمئن کیا اسی طرح اس نے اس کے جذبات و عواطف کو بھی تسکین و طمانیت عطا کی۔ (۶۲) اسی لئے وہ ایک مفسر کے لئے زبان کا بہترین ملکہ اور اسالیب کا اچھا ذوق بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہو گا کہ قرآن کے حسن

بیان کو سمجھ سکے اور دوسروں کے سامنے اسے پیش کر سکے۔ (۶۳)

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں مذکورہ اصول کا پورا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ وہ جب تفسیر بیان کرنے یا لکھنے کا قصد کرتے تو تفسیر کی کوئی کتاب اپنے سامنے نہیں رکھتے کیونکہ اس سے اس کے مولف کے خیالات سے متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا تھا (۶۴)۔ تقلید و اتباع سے بلند ہو کر جب انہوں نے اپنے وسیع علم و مطالعہ کی روشنی میں کتاب الہی کی تشریح کی تو فکر و عمل کی نئی جہات لوگوں کے سامنے آئیں۔ (۶۵)۔ اور قرآن کا پیغام علم جدید اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آنے لگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قرآن پر مجتہدانہ غور و فکر اور جدید انسان کے عقلی معیار کے مطابق قرآن حکیم کے پیغام کو پیش کرنے کی جو روایت شیخ محمد عبدہ نے قائم کی وہ وقت کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد متعدد عرب مفسرین نے ان کے طرز کی اتباع کی۔ (۶۶)

شیخ محمد عبدہ نے صرف اجتہاد، تفکر اور حریت رائے کی دعوت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تقلید اور اتباع پر شدید قسم کے حملے کئے۔ انہوں نے تقلید سے حاصل شدہ معلومات کو جہل اور ظلمت سے تعبیر کیا ہے اور اسے فہم قرآن کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے۔ وہ تفسیر کے اندر نقل و روایت کے شاکل مفسرین سے سخت ناراض تھے ان کی اس عادت کو انہوں نے فخر و غرور کے اظہار اور علمی تفوق کا سکہ جمانے کی خواہش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے زمانے کے مفسرین کو بہت پر سوز انداز میں یہ نصیحت کی ہے کہ وہ ان قدیم مفسرین کے طرز کو ہرگز اختیار نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ روز قامت ان سے مفسرین کے اقوال سے واقفیت سے متعلق سوال ہرگز نہیں کرے گا۔ وہ صرف یہ پوچھے گا کہ اس کی کتاب کو انہوں نے کس حد تک سمجھا؟ اس کے احکام و فرامین پر کتنا عمل کیا اور اس کے کتنے بندوں تک اس کا پیغام پیش کیا؟ (۶۷)

شیخ محمد عبدہ کی تفسیر اور دیگر علمی سرمایوں میں عقلیت کے غلبہ اور تقلید سے اجتناب کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ بلکہ صحیح یہ بات ہے کہ تفکر و تعقل ان کی شخصیت کا جزء لاینفک اور ان کی تفسیر کا سب سے نمایاں پہلو ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان کی عم پارہ کی مختصر ترین تفسیر کا مطالعہ کافی ہے۔ جس میں انہوں نے جنت و جہنم، نفع و ضرر، لوح محفوظ اور

کراما کاتبین پر جو کچھ لکھا ہے وہ قرآن کو دور جدید کے انسان کی عقل کے مطابق سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش ہے۔ (۶۸) یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس کوشش میں انہوں نے تفسیری روایات اور اقوال صحابہ کے علاوہ احادیث صحیحہ کا بھی انکار کیا ہے۔ جو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

عربی زبان و ادب اور اسلوب بلاغت

قرآن مجید چونکہ فصیح و بلیغ عربی زبان میں نازل ہوا اس لئے اس کو سمجھنے کے لیے عربی زبان پر قدرت و مہارت انتہائی ضروری ہے۔ تمام مفسرین کی طرح شیخ محمد عبدہ نے بھی عربی زبان کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

” نعم ان اکثر ما ذکر من وسائل فهم القرآن ، فنون العربية لا بد منها و اصطلاحات الاصول و قواعد الخاصة بالقرآن ضرورية ايضا . كقواعد النحو و المعاني و كذلك معرفة الكون و سنن الله فيه ، كل ذلك يعين على فهم القرآن “ (۶۹)

” بلاشبہ مذکورہ بالا مباحث میں سے اکثر و بیشتر فہم قرآن کے ذرائع ہیں، عربی زبان کے تمام فنون اور عربی نحو و صرف، علم المعانی وغیرہ کے اصول اور ان کی مصطلحات سے واقفیت فہم قرآن کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح کائنات اور اس میں کار فرما سنت الہی کا علم بھی ضروری ہے، یہ سب چیزیں فہم قرآن کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔“

عربی زبان و ادب کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں زبان و بلاغت سے متعلق مباحث کے تذکرہ میں حد سے زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ کیونکہ انکے سامنے یہ بات واضح تھی کہ ان مباحث میں ضرورت سے زیادہ الجھ کر قدیم مفسرین نے قرآن کے بنیادی مقاصد کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ مقاصد ہی ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں اور ان کی توضیح کا عنصر تفسیر قرآن میں سب سے غالب ہونا چاہیے۔ لیکن مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر تفسیر کی اکثر کتابوں میں یہ عنصر دب گیا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ عربی گرامر اور بلاغت سے متعلق مسائل ہیں۔ شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں۔

” و من سوء حظ المسلمين ان اكثر ما كتب في التفسير يشغل
قارنه عن المقاصد العالية و الهداية السامية فمنها ما يشغله عن
القرآن بمباحث الاعراب و قواعد النحو و نكت المعاني و
مصطلحات البيان.“ (۷۰)

” یہ مسلمانوں کے لئے بہت بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ اکثر تفاسیر اپنے
قارئین کو قرآن پاک کے بلند مقاصد اور ہدایت کے اعلیٰ مقام سے محروم
کر دیتی ہیں۔ قرآن سے غافل کر دینے والی چیزوں میں اعراب، نحو، علم المعانی
اور علم البیان کے نکات اور مصطلحات سے ضرورت سے زیادہ تعرض ہے۔“

محمد عبدہ عربی زبان و ادب کو فہم قرآن کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور تفسیر قرآن میں ان
سے بقدر ضرورت کام لینے کے قائل ہیں۔ لیکن وہ یہ بات نہایت صراحت اور شدت سے
بار بار دہراتے ہیں کہ ان سب چیزوں میں ان کی دلچسپی اور اٹھناک کا دائرہ محدود ہے۔ ان کی
تفسیر میں انکے پیش نظر اصل مقصد قرآن کی روح انقلاب اور اعجاز کی وضاحت اور پیشکش
ہوگی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

” وبتبعه بلا ريب: بيان وجوه البلاغة بقدر ما يحتمله المعنى و
تحقيق الاعراب على الوجه الذى يليق بفصاحة القرآن و بلاغته
اى عند الحاجة الى ذلك كالمسائل التى عدواها مشكلة ، وربما
نشير احيانا الى الاعراب من غير تصريح بعبارات النحو
الاصطلاحية ، كما نفعل ذلك فى بعض نكت البلاغة او قواعد
الاصول حتى لا تكون الاصطلاحات شاغلاً للقارى عن المعانى
وصارفة له عن العبرة“ (۷۱)

” اس کے بعد (یعنی قرآن مجید پر براہ راست غور و فکر اور اسکے مقاصد کی
وضاحت) اقسام بلاغت کا بیان ہوگا لیکن یہ بیان بقدر منجائش ہوگا۔ اسی طرح
اعراب پر بھی گفتگو ہوگی۔ لیکن اس میں یہ امر پیش نظر رہے گا کہ یہ قرآن کی
شان بلاغت کے مطابق ہو۔ گویا جب ضرورت ہوگی ہم مشکل مسائل سے تعرض
کریں گے۔ ہم کبھی کبھی اعراب سے متعلق مسئلے پر بات کریں گے۔ بلاغت کے

نکات اور دیگر علوم کے اصول و مبادی کی وضاحت میں ہمارا یہی طرز عمل ہوگا۔
ہمارا مقصود یہ ہے کہ فنی اصطلاحات ہمارے قارئین کو قرآن کے مفہیم اور
مواعظ سے غافل نہ کر دیں۔“

”تفسیر قرآن کے مطلوبہ معیار“ کی بحث میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ شیخ محمد عبدہ ایک عمدہ
تفسیر کے لئے پانچ شرائط کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں، ان میں پہلی دو کا تعلق عربی زبان
، اسلوب اور بلاغت سے ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان شرائط کو برتنے کے لئے بھی شیخ
محمد عبدہ کے یہاں کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ مفرد الفاظ کی تحقیق کے ضمن میں ان کا
خیال ہے کہ مفسر کو سب سے پہلے عہد رسالت اور عہد جاہلیت کے کلام عرب کی طرف
رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو نزول قرآن کے وقت کسی اور معنی میں
استعمال ہوتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ دوسرے معانی میں استعمال ہونے لگے۔ (۷۲)
ہمارے بعض مفسرین کرام نے اس حقیقت کو نظر انداز کر کے قرآنی الفاظ کی تشریحات میں
بعد کے ادوار کے استعمالات کا خیال رکھا۔ جس کی وجہ سے وہ فکر و عقیدہ کی بڑی بڑی لغزشوں
سے دوچار ہوئے۔ اس لئے وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ فہم صحیح کیلئے ناگزیر ہے کہ ملت کے
اندر بعد کے زمانوں میں رائج اصطلاحات اور قرآن مجید کے استعمالات میں دوری برقرار رکھی
جائے۔ انہوں نے اس کی مثال میں لفظ ”تاویل“ پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ قرآن کے اندر
لور عہد نبوی میں اس کا معنی و مفہوم اس سے مختلف تھا جو تیسری صدی ہجری میں رائج ہو گیا۔
الفاظ کی تحقیق کے ضمن میں دوسری اہم رہنمائی انہوں نے یہ کی کہ جو الفاظ قرآن میں متعدد
جگہوں پر استعمال ہوئے ان کو جمع کرنا چاہیے اور پھر اس کے معانی پر غور کرنا چاہیے۔ بسا
اوقات اسے معلوم ہو گا کہ ایک لفظ خود قرآن مجید کے اندر کئی مختلف معانی میں استعمال ہوا
ہے۔ ایسی شکل میں اس سے معنی مراد کے تعین میں آیت کے سیاق و سباق سے مدد ملے گی۔
اس کی مثال انہوں نے لفظ ہدایت سے دی ہے اور سورہ فاتحہ کی تفسیر میں اس پر گفتگو کر کے
عملی رہنمائی بھی فراہم کر دی ہے۔ (۷۳)

اسلوب اور بلاغت سے متعلق ان کا خیال ہے کہ ایک مفسر کو ان فنون کے اصول و مبادی اور
کی باریکیوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ یہ واقفیت فصیح و بلیغ عربی کلام کے مسلسل مطالعہ،

مشق و ممارست، زبان و بیان کے محاسن پر نظر اور معنی مراد سے آگہی سے شدید رغبت کے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ استعداد بہم پہنچالی جائے تو اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ وارفع کلام کے ہر پہلو کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن بقدر استطاعت اور حسب لیاقت فہم کی مشکلات آسان ہوتی جائیں گی۔ شیخ محمد عبدہ نے اسلوب و بلاغت کے ذیل میں ایک انتہائی اہم اور نکتے کی بات یہ کہی ہے کہ ان دونوں میں اچھی استعداد کا حصول کتابوں کے مطالعہ اور ان سے استفادہ کے علاوہ آدمی کے اپنے ذوق اور ملکہ پر منحصر ہے۔ (۷۴) کیونکہ عہد نبوت میں علوم و فنون کی تدوین کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی اصطلاحات اور اصول و مبادی سے واقف نہیں تھے۔ لیکن وہ زبان کا اتنا اچھا ذوق رکھتے تھے کہ قرآن جیسے فصیح و بلیغ کلام کی سماعت ہی ان کے دلوں پر جادو کی طرح اثر کرتی تھی۔ سیرت سرور عالم کا مطالعہ کیجئے تو کتنے ہی ایسے واقعات ملیں گے کہ عرب بدوؤں نے قرآن حکیم کی آیات سنی اور فوراً ایمان لائے۔ اس سلسلے میں شیخ محمد عبدہ نے ایک عرب دیہاتی لڑکی کا واقعہ بیان کیا جسے مشہور امام لغت الاصمسی نے کچھ اشعار گنگاتے ہوئے پایا تو اس کی فصاحت و بلاغت کی داد دی، اس لڑکی نے فوراً اس کے جواب میں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا حوالہ دیا اور یہ کہا کہ اس سے بہتر کلام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے بطور استشہاد یہ آیت پڑھی۔ (۷۵) "و اوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعہ فاذا خفت علیہ فالقبہ فی الیم و لا تخافی و لا تحزنی ، انا رادوہ الیک و جاعلوہ من المرسلین" (۲۷:۷)

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں عربی زبان و ادب سے متعلق مباحث میں اس امر کا خصوصی خیال رکھا ہے کہ قرآن کی عظمت اور وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔ گویا قرآن مجید کو اصل کی حیثیت حاصل ہو اور دیگر علوم و فنون اس کے تابع ہوں، انہوں نے تفسیر کے اندر متعدد مقامات پر ان مفسرین کی سخت گرفت کی ہے، جو لغت و بلاغت کے مقررہ اصولوں کی روشنی میں قرآنی آیات کا جائزہ لیتے ہیں اور قرآن کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس راہ میں اگر انہیں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو اسے ضرورت قافیہ یا تقاضائے تاکید وغیرہ کا نام دے کر ماننے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ نے اس طرح کے مفسرین کی سرزنش کی ہے اور یہ اصولی موقف پیش کیا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ

ہر چیز پر قادر ہے۔ ضرورت قافیہ، فاصلہ یا تاکید محض کا وجود اور ان کی رعایت انسانوں کے کلام میں ممکن ہے۔ خدا کے کلام میں ہرگز اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کا ہر لفظ انتہائی موزوں ہے اور اس میں زبان و بیان کی تمام تر رعنائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے ادراک کے لئے عقل سلیم اور ذوق لطیف کی ضرورت ہے، (۷۶)۔ شیخ محمد عبدہ کے اس موقف کی تفصیلات سورہ فاتحہ کی آیت ”الرحمن الرحیم“ (۷۷) اور سورہ بقرہ کی آیت ”ان اللہ بالناس لرؤف رحیم“ میں موجود ہیں۔ (۷۸)

تفسیر کی روایات

کتب تفسیر کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ ان کے اندر روایات کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ یہ روایات زیادہ تر ان قصص و حکایات اور تاریخی مقامات سے متعلق ہیں جو انبیاء کرام یا سابقہ کتب کے تذکرہ کے ضمن میں قرآن حکیم میں مفصل یا مجمل طور سے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی روایات کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے ذریعہ چند اشخاص یا مذہبی گروہوں نے اپنے مذہبی یا مسلکی خیالات کی تائید کی ہے۔ مزید یہ کہ آیت متشابہات کی تاویل اور قرآن کے مجمل بیانات کی توضیح کی بے جا خواہش نے بھی بعض مفسرین کو مفروضہ اور بے بنیاد روایات سے مدد لینے کے لئے راغب کیا۔ شیخ محمد عبدہ چونکہ تدبر و تفکر، حریت رائے اور اجتہاد کے علمبردار اور تقلید و اتباع کے مخالف تھے اس لئے انہوں نے اس طرح کی تمام کوششوں پر اظہار تکلیف کیا ہے اور انہیں تسلیم کرنے یا ان سے استدلال کرنے سے صاف لفظوں میں منع کر دیا ہے۔ انہوں نے ان روایات کے پرکھنے کا ذریعہ بھی قرآنی تعلیمات کی روح سے ہم آہنگ عقل و فکر کو بتایا ہے۔ جو ان کے نزدیک دین میں خرافات و اوہام کی آمیزش کو قبول نہیں کر سکتی۔ (۷۹)

یوں تو محمد عبدہ نے ہر طرح کی کمزور اور بے بنیاد روایات کی تردید کی ہے لیکن مقدار میں زیادہ ہونے کے سبب ان کی تنقید کا نشانہ سب سے زیادہ وہ روایات بنی ہیں جنہیں اسرائیلیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ روایات زیادہ تر یہود و نصاریٰ اور ایران کے طہدین کے ذریعہ نقل ہو کر آئی ہیں۔ اور تفصیل و اطناب کے دلدادہ مفسرین نے انہیں بغیر کسی تحقیق کے اپنی تفاسیر میں داخل کر لیا۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں اس طرح کی روایات پر کوئی

توجہ نہیں دی ہے اور ان سے مکمل اجتناب کیا ہے۔ (۸۰)
 ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں
 بیشتر مفسرین نے کئی کئی صفحات لکھ ڈالے ہیں، محمد عبدہ صرف چند سطور میں بعض اصولی
 باتیں کہہ کر گزر گئے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت ”واذ قلنا ادخلوا هذه القرية فكلوا
 منها حيث شئتم“ میں انہوں نے گاؤں کی صراحت سے بالکل احتراز کیا ہے۔ (۸۱) اسی طرح
 وہ آیت ”فانزلنا على الدين ظلموا رجزا من السماء“ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”نسکت عن تعيين الرجز كما هو شأننا في كل ما ابهمه القرآن“ (۸۲)

”ہم ”رجز“ کی تعیین پر خاموشی اختیار کریں گے۔ ہمارا اتمام مبہمات قرآن کے بارے
 میں یہی موقف ہے“ اسی طرح سورہ البروج اور سورہ الفجر میں ”اصحاب اخدود“ اور ”عاد ارم
 ذات العماد“ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے انہوں نے روایات سے بالکل تعرض نہیں کیا بلکہ
 اس کے علی الرغم ان پر تنقید کی ہے اور ایک اصولی موقف پیش کیا ہے۔ (۸۳)

شیخ محمد عبدہ نے یہی موقف ان مفسرین کے بارے میں بھی اختیار کیا جنہوں نے
 شخصی اور مسلکی میلانات و رجحانات کے تحت قرآنی آیات کی من مانی تاویلیں کی ہیں او
 اپنے مسلک کی حمایت میں ضعیف اور کمزور روایتوں کا سہارا لیا ہے۔ محمد عبدہ کے نزدیک
 شفاعت، زیارت قبور اور تکریم اہل بیت وغیرہ سے متعلق روایات اسی زمرہ میں داخل
 ہیں اور اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی طرف توجہ دی جائے۔ (۸۴)

انہوں نے آیات متشابہات کے بارے میں بھی حزم و احتیاط اور توقف کا موقف اختیار
 کیا۔ چنانچہ سورہ عبس کی آیت ”وفاكهة و ابا“ کے ضمن میں حضرت عمرؓ کا ایک قول نقل
 کر کے اس کی تشریح کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب کے اندر جو کچھ ہے اس کی تلاش و
 جستجو ہونی چاہیے اور اس سے باہر کی چیزوں کے چکر میں پڑنے سے احتیاط کرنی چاہیے۔ بحیثیت
 مومن ہماری یہی ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن کو سمجھیں۔ (۸۵)

شیخ محمد عبدہ نے حروف مقطعات کے بارے میں بھی یہی موقف اختیار کیا۔ وہ انہیں
 ان سورتوں کے نام قرار دیتے ہیں جن کے شروع میں یہ آئے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان کی
 مزید تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کیونکہ اس میں لغزش کا امکان ہوتا ہے۔ ان

کے خیال میں صحابہ کرام کا بھی یہی موقف تھا۔ (۸۶)

اسرائیلی روایات ہوں یا آیات متشابہات کے متعلق تاویلات ہوں یا ان دونوں کے علاوہ فلاسفہ، متکلمین، صوفیاء، فقہاء اور دیگر مذہبی جماعتوں کے استنباطات اور تخریجات ہوں، شیخ محمد عبده کا ان سب کے بارے میں مشترک خیال یہ ہے کہ یہ فہم قرآن کے تئیں جرأت بجا اور تکلیف مالا یطاق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ہدایت کے اعتبار سے مکمل شکل میں اتارا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس کی اپنی توضیحات کافی ہیں، اس لئے مفسرین کرام کو کتاب الہی اور سنت نبوی پر اکتفا کرنا چاہیے تھا، اس کے مجمل اور متشابہ مقامات سے متعلق جزئیات کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ قرآن مجید نے انہیں اس کی ہدایت نہیں کی تھی اور نہ ہی یہ کتاب اللہ کے نشا کے مطابق تھا۔ اگر یہ تفصیلات قرآن مجید کی شان اور پیغام سے مطابقت رکھتیں تو سب سے پہلے خود قرآن میں مذکور ہوتیں۔ ورنہ کم از کم رسول کریم ان پر روشنی ڈالتے کیونکہ وہ شارح قرآن بھی تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین کی روایات سے دلچسپی اور انہماک کا محرک کتاب اللہ کی خدمت نہیں بلکہ ان کی اپنی پسند اور ترجیحات تھیں۔ جنکی تکمیل کے لئے انہوں نے غیب پر دست درازی کی، بے بنیاد روایات کا سہارا لیا حتیٰ کہ وضع حدیث اور اسلاف کی طرف بے بنیاد باتوں کے انتساب کا جرم عظیم بھی کیا۔ (۸۷)

روایات کے بارے میں شیخ محمد عبده کے مذکورہ بالا سخت اور بے لچک موقف کی سب سے بڑی وجہ ان کا یہ خیال تھا کہ ان روایات سے قرآن حکیم کی صاف ستھری تعلیمات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور یہ روایات فہم قرآن کی راہ میں حجاب بن گئیں۔ چنانچہ تفسیر المنار کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:-

(ترجمہ) "فلاسفہ اور متکلمین کے مجادلات، فقہاء اور علماء اصولیین کی

تخریجات، صوفیاء اور علماء باطن کی تاویلات اور مذہبی و مسلکی فرقوں کے

تعصبات اور باہمی اختلافات نے قرآن کریم کے پیغام اور دعوت سے

لوگوں کو غافل کر دیا، پھر روایات کی کثرت اور اسرائیلی خرافات نے اس

غفلت کو اور بڑھا دیا۔ امام رازی نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ انہوں نے اپنی

تفسیر میں وہ تمام نئے علوم جیسے ریاضی، طبیعیات، ہیئت اور فلکیات وغیرہ داخل کر دئے جن سے عہد نزول کے وقت عرب معاشرہ بالکل ناواقف تھا۔ نتیجتاً یہ سب چیزیں فہم قرآن کے لئے رکاوٹ بن گئیں۔ (۸۸)

روایات کی طرح آیات مشابہات کے بارے میں بھی انہوں نے اپنے سخت موقف کی تائید میں مضبوط دلائل دئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی مشابہ اور مجمل آیات سے متعلق کتب تفسیر کے اندر موجود تفصیلات غیر ضروری اور بے بنیاد ہیں۔ ہم اس کے مکلف نہیں۔ اس لئے ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمیں اس بات پر ایمان لانا چاہئے کہ ان کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اگر وہ چاہتا تو ہمیں ضرور ان تفصیلات سے آگاہ کرتا۔ (۸۹)

احادیث صحیحہ اور محمد عبیدہ

تفسیر قرآن میں روایات کا ایک حصہ احادیث نبوی، اقوال صحابہ اور اقوال تابعین پر مشتمل ہے۔ شیخ محمد عبیدہ انہیں قبول کرنے میں بھی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ انکے شاگرد علامہ رشید رضا نے مقدمہ تفسیر المنار میں احادیث کے بارے میں انکے موقف کی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کا موقف علامہ ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبل کے موقف سے قریب ہے۔ ان کی طویل بحث کا خلاصہ سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:-

”نبی کریم، صحابہ کرام اور تابعین عظام سے جو روایات نقل کی جاتی ہیں وہ ہمارے نزدیک بہت اہم ہیں۔ ہم ان کی صحت کی تصدیق کے بعد ان سے استدلال کریں گے، خاص طور سے وہ روایات جن میں ہدایت و موعظت کے عمدہ نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اور عہد نزول قرآن کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ ہمارے بہت کام کی ہیں۔ لیکن ان روایات سے متعلق ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی موضوع ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کی سازشوں کے نتیجے میں ذخیرہ تفسیر میں داخل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے ان روایات کو ہم قبول نہیں کر سکتے اس باب میں ہم امام ابن تیمیہ اور احمد بن حنبل کے خیالات کی تائید کرتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ نے تفسیری روایات کے اختلاف وغیرہ پر بحث کرنے کے

بعد یہ لکھا ہے کہ وہ صرف صحیح احادیث کو قبول کرنے کے حق میں ہیں۔ اسرائیلی روایات کے سلسلے میں وہ احتیاط کے قائل ہیں۔ تابعین اور تبع تابعین کے اقوال کے سلسلے میں بھی وہ توقف سے کام لیں گے۔ ان کے بالمقابل صحابہ کرام کی طرف منسوب اقوال کو وہ غور سے دیکھیں گے اور نبی کریم سے براہ راست استفادہ کے امکان سے وہ انہیں قبول بھی کر لیں گے۔ امام ابن تیمیہ کے علاوہ امام احمد بن حنبل بھی روایات کے سلسلے میں ہمارے موقف کی تائید کی ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے۔ ”تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں، تفسیر، ملاحم اور مغازی“۔

”مذکورہ بالا دونوں جلیل القدر علماء اسرائیلی روایات کی تردید اور ان سے عدم استدلال پر متفق ہیں خواہ وہ روایات جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ کے بیان میں صراحت ہے کہ کعب الاحبار اور وہب بن مدینہ جیسے ثقہ حضرات سے مروی ہوں۔ تابعین کی روایتوں کے بارے میں بھی ابن تیمیہ جیسے عالم توقف اختیار کرتے ہیں۔ اور صحابہ کرام کی روایات کو بھی یکنخت قبول نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تابعین کے بالمقابل صحابہ کے اقوال کی قبولیت کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء کی یہ رائے کہ صحابہ کرام کی مرویات کا حکم حدیث مرفوعہ کا ہے اور انہیں بلا تحقیق تسلیم کرنا چاہیے، محل نظر ہے۔“ (۹۰)

شیخ محمد عبدہ کے تفسیری افکار پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو فہم قرآن کی راہ میں مانع ہو ان کے نزدیک ناقابل اعتناء ہے۔ وہ مقدمہ المنار میں لکھتے ہیں:-

(وغرضنا من هذا كله ان اكثر ما روى في التفسير المأثور او كثيره حجاب على القرآن و شاغل لتاليه عن مقاصده العلية المزكية للانفس المنورة للعقول.)

”ان سب تفصیلات کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تفسیر ماثور کا اکثر و بیشتر حصہ قرآن کے لئے حجاب ہے اور اس کی تلاوت کرنے والے کو

ان بلند مقاصد سے غافل کر دیتا ہے جن سے نفس کو تزکیہ اور عقل کو
روشنی حاصل ہوتی ہے۔“ (۹۱)

انہوں نے حدیث کے بارے میں اپنے مذکورہ موقف کا اظہار ان آیات کی تفسیر کے
ذیل میں خاص طور سے کیا ہے۔ جن کے زمانہ نزول کے حوالہ سے بکثرت روایات کتب
تفسیر میں موجود ہیں۔ چنانچہ سورہ الکوثر میں ”کوثر“ سے اکثر مفسرین نے جنت کی ایک نہر
مراد لیا ہے۔ اور اس کی تائید میں احادیث پیش کی ہیں۔ شیخ محمد عبدہ اس سے رسالت مراد لیتے
ہیں جس کا فیضان تاقیامت جاری رہے گا۔ پھر انہوں نے متعلقہ احادیث پر گفتگو کی ہے اور
یہ بتایا ہے کہ کثرت کے باوجود یہ احادیث تو اتر کی شرط پر پوری نہیں اترتیں۔ دوسری طرف
چونکہ ان روایات میں نبی کریم کے غیر معمولی اعزاز و اکرام کی بات کی گئی ہے اس لئے ہمارے
محدثین اور مفسرین نے عقیدت کے غلبہ کی وجہ سے ان کی صحت پر بہت زیادہ کلام نہیں کیا
اور یہ چیز تو اتر کے لئے مانع ہے کیونکہ اس کی ایک اہم شرط رواۃ کا طرفداری اور تعصب سے
پاک ہونا ہے۔ (۹۲)

اسی طرح انہوں نے تفسیر ”الفلق“ میں سحر سے متعلق تمام روایات کو رد کر دیا ہے اور
انہیں شان نبوت کے منافی قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس سحر
کی قرآن کریم نے ایک سے زائد آیات میں تردید کی ہے، ہمارے مفسرین نے اس سورہ
میں روایات پر انحصار کر کے حضور کریم کی ذات گرامی پر اس سحر کے اثرات کے وقوع پزیر
ہونے کی تصدیق کر دی۔ یہ نبی آخر الزماں پر کھلا ہوا الزام ہے اور ان کی معصومیت کے خلاف
ایک چیلنج ہے۔ اس لئے بخاری جیسی صحیح کتاب میں سحر سے متعلق ان روایات کی موجودگی
کے باوجود انہوں نے ان کی صداقت اور صحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک
آیت ”من شر غاسق اذا وقب و من شر النفاثات فی العقد“ سے مراد چغل خور اور
تعلقات کو خراب کرنے والے لوگ ہیں۔ گویا انہوں نے الفاظ کی روشنی میں ان آیات کا
معنی متعین کیا اور روایات سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ (۹۳)

تفسیر سورہ الفلق میں سحر سے متعلق روایات کا انکار کرتے ہوئے انہوں نے بعض ایسی
باتیں کہی ہیں جو انتہائی اہم اور اصولی نوعیت کی ہیں اور جن کی مدد سے ہمیں حدیث کے

بارے میں ان کے موقف کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے وہ لکھتے ہیں:

”یہ ایک واجب التسلیم حقیقت ہے کہ قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق قطعی اور حتمی ہیں۔ یہ کتاب نبی کریم سے جو اثر منقول ہے جس بات کو یہ کتاب تسلیم کرے وہ واجب الاعتقاد ہے اور جس کی نفی کرے اس کا انکار لازم ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے نبی معصوم سے سحر کی نفی کی ہے اور کفار کے اس قول پر کہ ”آپ مسحور ہیں“ اس نے گرفت کی ہے اور برے انجام سے آگاہ کیا ہے۔ اب اگر کسی حدیث میں اس سحر کے آپ کی ذات پر اثرات اور اس کی موجودگی کا تذکرہ اور اثبات ہو تو ہم اس حدیث یا احادیث کو کیسے صحیح مان لیں؟ اس لئے کہ ہمارا یہ موقف ہے کہ عقائد کے باب میں اخبار آحاد سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا۔ اس اصول کی روشنی میں مذکورہ حدیث صحیح ہونے کے باوجود ناقابل احتجاج ہے۔ چونکہ نبی کریم کا سحر کی تاثیر سے محفوظ رہنا اسلامی عقائد میں سے ایک ضروری عقیدہ ہے اس لئے اس ضمن میں ظنی دلیل کافی نہیں۔ مزید برآں خبر واحد سے ظنی علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی صحت ثابت ہو جائے۔ غیر صحیح ہونے کی صورت میں تو خبر واحد مفید ظن بھی نہیں ہوتی۔“ (۹۴)

مذکورہ بالا مباحث اور بعض دوسرے حوالوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شیخ محمد عبدہ کے نزدیک ”قرآن کی تفسیر قرآن کے استعمالات اور عقل سلیم کی روشنی میں کی جائے“ قرآن فہمی کار ہنما اصول ہے اس کے بعد صحیح احادیث کا نمبر ہے۔ لیکن وہ صرف ان ہی روایات کو قبول کرتے ہیں جو سند کے لحاظ سے صحیح ہونے کے علاوہ قرآن اور اسلام کی بنیادی تعلیمات اور تصورات سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کی حیثیت خبر قطعی اور متواتر کی ہے جبکہ احادیث کی حیثیت خبر ظنی اور غیر متواتر کی ہے۔ اس لئے خبر قطعی اور متواتر کو خبر ظنی اور غیر متواتر پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ شیخ محمد عبدہ کے یہاں تواتر کی شہادت صرف قرآن کے

باب میں پوری ہوئی ہے۔ اور کوئی حدیث اس شرط کو پورا نہیں کرتی، (۹۵)

اخلاقی اور معاشرتی مسائل

شیخ محمد عبدہ ایک ممتاز مفکر اور عظیم مصلح تھے۔ وہ مبصر اور عالم اسلام کی اخلاقی و معاشرتی زبوں حالی پر انتہائی ملول اور اسے اس حالت زار سے نجات دلانے کے لئے کوشاں و سرگرداں تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ملک و ملت کے حالات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنی معلومات میں وسعت اور کوششوں کو بامراد بنانے کیلئے یورپ کا سفر بھی کیا تھا اور اسلامی لٹریچر کے علاوہ مغربی مصنفین کی تالیفات سے استفادہ کیا تھا۔ ان تمام کاوشوں کا مقصود اور محرک اصلاح و تجدید کے مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا کیونکہ یہ مشن انہیں ان کی زندگی سے زیادہ عزیز تھا۔ (۹۶) ظاہر ہے ایسا شخص فطری طور سے اپنی بات کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے ہمہ آن بے چین رہتا ہے اور اس کیلئے کوئی مناسب موقع ضائع کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ شیخ محمد عبدہ کا یہی حال تھا۔ اس کی تائید و تصدیق کے لئے ان کی تفسیر کا مطالعہ کافی ہے۔ (۹۷)

نزول قرآن مجید کی ایک اہم غرض و غایت انسان کا تزکیہ اور معاشرہ کی صحیح خطوط کے مطابق تعمیر و تشکیل تھی۔ اس مقصد کے تحت قرآن پاک میں اخلاقی اصول و ضوابط اور معاشرتی اقدار و اساسیات کا جامع تعارف پیش کیا گیا اور فرد و معاشرہ کو ان کی تعمیل اور ان سے آراستہ ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تاریخ انسانی سے مختلف اقوام اور اشخاص کی مثالیں پیش کر کے تزکیہ و تربیت کے عمل سے گزرنے کی ترغیب دلائی ہے اور انحراف کی شکل میں انجام بد سے دوچار ہونے کی وعید سنائی۔ (۹۸)

شیخ محمد عبدہ قرآن مجید کے اندر اصلاح و تربیت سے متعلق آیات پر کچھ دیر ضرور ٹھہرتے اور ان کی وضاحت قدرے تفصیل سے کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ موقع کی تلاش میں تھے اور اسے پالنے کے بعد اسے ضائع کرنا بڑی حرماں نصیبی تصور کرتے تھے۔ شیخ کا معمول تھا کہ وہ متعلقہ آیات کے مفہوم و مدعا کی وضاحت کے ساتھ امت مسلمہ پر ان کے انطباق اور اس کی روشنی میں امت کے احوال کا جائزہ اور مناسب رہنمائی کا کام بھی کرتے تھے۔ اس لئے اخلاقی و معاشرتی امراض کی تشخیص اور علاج کے تعین کے ضمن میں ان کی تفسیر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ (۹۹) اس کا اصل اندازہ تو ان کی تفسیر کے مطالعہ

سے ہو گا لیکن یہاں چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہیں۔
 سورہ ”و العصر“ کی آیت ”وتواصوا بالصبر“ کی تفسیر میں انہوں نے سب سے پہلے
 صبر کا معنی بتایا ہے۔ اس کے بعد مسلم معاشرہ کے زوال اور بد حالی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا
 اصل سبب صبر کا فقدان قرار دیا ہے، اور یہ زور دیکر کہا ہے کہ اگر مسلم عوام اور مسلم سماج اپنی
 اصلاح کا متمنی ہے اور ترقی کی راہ پر چلنے کا خواہاں ہے تو اسے اخلاق عالیہ کے سرچشمہ ”صبر“
 سے متصف ہونا ہو گا۔ اس ضمن میں انہوں نے علماء کرام اور اساتذہ و طلبہ کی ذمہ داریاں یاد
 دلائیں اور انہیں ان ذرائع و وسائل کی تحصیل اور استعمال کے لئے آمادہ کیا جو ادائیگی فرض کیلئے
 ضروری ہیں (۱۰۰)

اسی طرح انہوں نے سورہ ”الانفطار“ کی آیت ”ان الابرار لفی نعیم“ کی تشریح
 بھی بہت تفصیل سے کی ہے۔ ان کے نزدیک نیکو کار وہ شخص ہے جس کی شخصیت اور مال و
 دولت سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو عبادات کا پابند ہو لیکن اس کی
 شخصیت اور دولت سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچ رہا ہو وہ نیکو کار نہیں بلکہ اس بات کا اندیشہ ہے
 کہ بعض حالات میں اس کا شمار نجا میں نہ ہو جائے۔ (۱۰۱)

چنانچہ وہ سورہ ”الماعون“ کی آیت ”ولا یحض علی طعام المسکین“ کی تشریح
 میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں دین دار لوگوں کو فقیروں اور محتاجوں کی اعانت پر ابھارا گیا ہے۔ خواہ
 یہ اعانت دوسروں سے چندہ جمع کر کے کی جائے جیسا کہ رفاہی اور فلاحی انجمنوں کا طریقہ کار
 ہے۔ اس طرح کی تمام کوششوں کی بنیاد قرآن حکیم کی اس آیت میں موجود ہے۔ (۱۰۲)
 شیخ محمد عبدہ کی تفسیر میں اس طرح کی بکثرت مثالیں موجود ہیں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ
 ان کی تفسیر کا بہت نمایاں پہلو ہے۔ اس کا اعتراف ان تمام لوگوں نے کیا ہے جو ان کی فکر سے
 آگاہ تھے اور ان کی تصانیف سے مستفید ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ لکھتے ہیں:-

”نہج فی تفسیرہ منہجا ادبیا اجتماعیا فکان یکشف عن بلاغۃ

القرآن باسلوب مشرق جذاب و یعالج مشاكل المسلمین بما

یرشد الیہ القرآن و یعرض الی سنن اللہ الکوئیۃ فیینہا و ین

ان القرآن متمش مع ہذہ السنن لا یصادمہا لانہا من مستلزمات

الفطرۃ“ (۱۰۳)

انہوں نے اپنی تفسیر میں ایک ادبی اور معاشرتی نہج اختیار کیا تھا چنانچہ وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو انتہائی دلکش اور جاذب نظر اسلوب میں پیش کرتے تھے اور قرآن کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے مسائل کا حل پیش کرتے تھے۔ وہ کائنات میں کار فرما اللہ تعالیٰ کے قوانین اور سنت کا حوالہ دیتے تھے۔ اور انکی تشریح کرتے تھے۔ نیز یہ بتاتے تھے کہ قرآن ان قوانین فطرت ہے ہم آہنگ ہے۔ اس کا ان سے کوئی تصادم نہیں۔

ڈاکٹر محمد عثمان امین نے جو شیخ محمد عبدہ کی شخصیت اور فکر کے ایک بڑے شارح تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر ایک عمدہ بحث کی ہے۔ اس کی آخری سطور کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

”ہمارے نزدیک ان کی تفسیر کا ایک نادر وصف یہ ہے کہ وہ مصری معاشرے کی اصلاح کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ یہ تفسیر خالص اخلاقی روح سے مملو اور اسی کے ساتھ عصری مذاق اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔“ (۱۰۴)

جدید علمی اور سائنسی نظریات

شیخ محمد عبدہ نے قرآن مجید کی بعض آیات کی تشریح سائنس کے جدید نظریات کی روشنی میں کی ہے۔ دراصل وہ قرآن مجید کو علوم و فنون کا خزانہ اور سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان علمی و فکری اعتبار سے خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ ہو جائے، قرآن پاک کی ہدایت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید جدید سائنسی علوم اور ترقیات سے متصادم نہیں بلکہ ان کا حامی اور معاون ہے۔ (۱۰۵) اگر قرآن پاک میں کسی جگہ جدید علوم سے ٹکراؤ یا تصادم نظر آتا ہے تو اس میں اس کا تصور نہیں بلکہ اس فرد کی نگاہ کا تصور ہے جو فہم قرآن کا خواہاں ہے۔

شیخ محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں مذکورہ بالا اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے تحت انہوں نے ایک طرف قرآن مجید کی بعض آیات کی تشریح جدید معلومات کی روشنی میں کی ہے تو دوسری طرف بعض ایسی آیات کی نئی تاویل پیش کی ہے جن کی تفہیم عصر حاضر کے عقلیت پسند انسان کے لئے مشکل ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی طرف سے

اس طرح کی تمام کوششیں نیک نیتی اور اخلاص پر مبنی تھیں۔ وہ قرآن مجید کو متعارف اور اس کی دعوت کو عام کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوئے اس کا صحیح اندازہ ان کے مجموعہ تفاسیر کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ (۱۰۶) یہاں ان کے نہج تفسیر کی وضاحت کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

وہ ”واذا السماء انشقت“ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہی کہ انشقاق کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کو ختم کرنا چاہے گا تو سب سے پہلے آسمان پھٹ جائے گا اور اس میں جو ترکیب پائی جاتی ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ اس کا پورا نظام بکھر جائے گا۔ یہ صورت کسی عظیم حادثہ کے رونما ہونے سے بھی پیش آسکتی ہے۔ مثلاً ایک سیارہ چلتے چلتے دوسرے سیارہ کے قریب پہنچ جائے اور اس طرح دونوں کا تصادم ہو جائے۔ اس کے نتیجے میں سورج کا نظام درہم برہم ہو جائیگا اور قضا میں چاروں طرف مختلف ٹکڑیوں میں بادل چھا جائے گا۔ اس کے بعد آسمان کا نظام بھی باقی نہ رہے گا۔ (۱۰۷)

سورہ فیل کی آیت ”وارسل علیہم طیرا ابابیل“ کی تفسیر میں وہ کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کی ہلاکت کا سبب چچک کا مرض تھا اور یہ بیماری ان سنگ ریزوں کے ذریعہ پھیلی تھی جنہیں مکھی یا چمچر کے قبیل کے پرندوں نے لشکر پر پھینکا تھا۔ گویا پتھریا مٹی کے ان ذرات میں بعض امراض مثلاً چچک، خسرہ وغیرہ کے جراثیم تھے، انہوں نے اپنی رائے کی تائید میں عکرمہ اور یعقوب بن عتبہ کی وہ روایت بھی پیش کی ہے جس میں صراحت ہے کہ عربوں نے چچک اور خسرہ کی بیماری کا سب سے پہلا مشاہدہ ”عام الفیل“ میں کیا تھا۔ (۱۰۸)

اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت ”او کصیب من السماء فیہ ظلمات و رعد و برق“ کی تشریح میں انہوں نے بہت سی جدید سائنسی ایجادات مثلاً ٹیلیفون اور ٹیلیگرام وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان ان سے تبلیغ کا کام نہیں لیتے۔ (۱۰۹)

جدید نظریات سے استفادہ اور غور فکر کی صلاحیت کے آزادانہ استعمال کی حوصلہ افزائی کی ایک مثال سورہ بقرہ کی آیت ”واذا قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس“ کی تفسیر میں بعض مفسرین کی ایک رائے کے تذکرہ اور اس کی خاموش حمایت میں ملتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں ”ملائکۃ“ سے مراد وہ تمام روحانی قوتیں ہیں جو اس دنیا کے اندر

موجود مخلوقات کے اندر الگ الگ ودیعت کی گئی ہیں اور جن پر اس دنیا کا نظام قائم ہے۔ اور آدم سے مراد ایک ایسی نسل کی تخلیق ہے جو تمام مخلوقات سے برتر ہوگی اور سجدہ کرنے سے مراد ان ارواح و قوئی کو اس نئی قوت اور مخلوق کے سامنے سرنگوں ہونے اور اسکی تابعداری کرنے کا فیصلہ ہے۔ جس کے مطابق تیار ہونے والی نئی مخلوق پہلے سے موجود تمام مخلوقات کو مسخر کرے گی اور ان کی قوتوں اور صلاحیتوں سے زمین کی تعمیر و ترقی کا کام لے گی اور ابلیس کے سجدہ نہ کرنے سے مراد کائنات میں موجود ایک قوت کی عدم تسخیر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ قوت اس کائنات کا جزو لاینفک ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو کامل کو ناقص اور ہدایت یافتہ کو گمراہ کر دیتی ہے۔ یہی قوت ہے جو انسان کو اس کی صلاحیتوں کے استعمال سے روکتی ہے اور اسے خلافت کے مقام تک پہنچنے کے لئے ہر ممکن طور سے مزاحمت کرتی ہے۔ (۱۱۰)

مفسرین کا یہ گروہ گویا قصہ آدم و ابلیس کو ایک تمثیلی واقعہ مانتا ہے، ان کے اس موقف کی تائید قرآن کے سیاق و سباق اور الفاظ وغیرہ سے بالکل نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے جو قرآن پر غور و فکر کا عادی ہو۔

مراجع و ماخذ

- ۱۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“ دار الہلال مصر (ب۔ت) ص ۲۰-۲۱
- ۲۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری الامام محمد عبدہ۔ مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ۔ ۱۹۵۵ء ص ۱۹
- ۳۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ۔ ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۲-۲۸۳
- ۴۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“ ص ۲۵
- ۵۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری۔ ص ۲۰
- ۶۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“ ص ۲۷

- ۷۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث۔ ص ۲۸۵-۲۹۰
- ۸۔ ایضاً ص ۲۹۰-۲۹۱
- ۹۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“ ص ۲۸-۲۹
- ۱۰۔ ایضاً ص ۲۹-۳۰
- ۱۱۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، جلد اول، دار الفکر العربی طبع، بیستم، ۱۹۷۰ء
ص ۲۸۳-۲۸۵
- ۱۲۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“، ص ۳۳
- ۱۳۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث ص ۲۸۵
- ۱۴۔ استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“ ص ۳۴
- ۱۵۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۲۹
- ۱۶۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۰-۲۹۲
- ۱۷۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، جلد اول، دار المنار مصر، طبع چہارم، ۱۳۷۳ھ، ص ۱۱
- ۱۸۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۳۲-۳۳
- ۱۹۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۰۷-۳۰۸
- ۲۰۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۳-۲۹۴
- ۲۱۔ شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“ ص ۳۸
- ۲۲۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۱۵
- ۲۳۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۵-۲۹۷
- ۲۴۔ شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق، سوانح مصنف ”دروس من القرآن الکریم“ ص ۲۹
- ۲۵۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۲۹۷
- ۲۶۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۳۷-۳۸
- ۲۷۔ ایضاً ص ۳۹-۴۰
- ۲۸۔ عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث، ص ۳۰۱
- ۲۹۔ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار جلد اول، دار المنار مصر طبع چہارم، ۱۳۷۳ھ، ص ۱۲-۱۳
- ۳۰۔ ایضاً ص ۱۴

- ۳۱ محمد عبده تفسیر جزء عم، مطابع الشعب قاہرہ، طبع پنجم، بابت
- ۳۲ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، جلد دوم، دارالکتب الحدیثہ (بدون مقام)
طبع دوم، ۱۹۷۶ء، ص ۵۵۲۔
- ۳۳ محمد عبده، تفسیر سورہ العصر، مطبعۃ المنار، ۱۳۳۰ھ، ص ۲
- ۳۴ محمد عبده، دروس من القرآن الکریم، دارالہلال مصر، ب۔ ت، مقدمہ ص ۷۔ ۱۹
- ۳۵ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، ج اول ص ۱۳
- ۳۶ ایضاً ص ۱۲
- ۳۷ ڈاکٹر محمد عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۰۱
- ۳۸ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار ص ۱۲-۱۵
- ۳۹ ایضاً ص ۱۲
- ۴۰ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث ص ۳۲۹
- ۴۱ رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، ص ۵-۷
- ۴۲ ایضاً ص ۲۵-۳۰
- ۴۳ ایضاً ص ۲۸-۲۹
- ۴۴ ایضاً ص ۱۹-۲۰
- ۴۵ ایضاً ص ۱۷
- ۴۶ ایضاً ص ۱۸-۱۹
- ۴۷ ایضاً ص ۲۵-۲۶
- ۴۸ ایضاً ص ۲۱-۲۲
- ۴۹ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، ص ۶۸۳-۶۸۷
- ۵۰ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۲۱-۲۲
- ۵۱ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۳۸-۱۳۹
- ۵۲ محمد عبده تفسیر جزء عم، ص ۲۷
- ۵۳ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۳۸
- ۵۴ محمد عبده، دروس من القرآن الکریم، ص ۳۸-۵۲

- ۵۵۔ رشید رضا، تفسیر المنار، جلد اول ص ۱۰۵
- ۵۶۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۳-۱۵۴
- ۵۷۔ محمد عبده، دروس من القرآن الکریم ص ۷۹-۸۰
- ۵۸۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۲۹-۱۵۰
- ۵۹۔ ایضاً ص ۱۵۰
- ۶۰۔ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۲۷
- ۶۱۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۲۷
- ۶۲۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۲۸
- ۶۳۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۷-۲۵
- ۶۴۔ ایضاً ص ۱۲
- ۶۵۔ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، ص ۵۵۸
- ۶۶۔ ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ، لمحات فی علوم القرآن، المکتب الاسلامی، طبع سوم، ۱۹۹۰ء، ص ۳۱۳-۳۱۵
- ۶۷۔ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، ص ۵۵۸-۵۶۰
- ۶۸۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۳
- ۶۹۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۷
- ۷۰۔ ایضاً ص ۷
- ۷۱۔ ایضاً ص ۱۹
- ۷۲۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۲۸
- ۷۳۔ مقدمہ تفسیر المنار، ص ۲۱-۲۲
- ۷۴۔ ایضاً ص ۲۲
- ۷۵۔ ایضاً ص ۲۸
- ۷۶۔ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۴-۱۵۵
- ۷۷۔ رشید رضا، تفسیر المنار، ج اول ص ۲۶-۲۷
- ۷۸۔ ایضاً، ج دوم، دار المنار مصر، طبع سوم، ۱۳۶۷ھ، ص ۱۲-۱۳

- ۷۹- رشید رضا، مقدمہ تفسیر المنار، ص
- ۸۰- ایضاً ص ۸-۱۰
- ۸۱- تفسیر المنار، ج اول، ص ۳۲۳
- ۸۲- ایضاً ص ۳۲۵
- ۸۳- شیخ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۳۵-۳۶- ایضاً ص ۶۱
- ۸۴- ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۱
- ۸۵- شیخ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۱۸
- ۸۶- رشید رضا، تفسیر المنار، ج اول ص ۱۲۲-۱۲۳
- ۸۷- ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۵۰-۱۵۱
- ۸۸- مقدمہ تفسیر المنار، ص ۷
- ۸۹- مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر عثمان امین کی کتاب، رائد الفکر المصری ص ۱۵۱-۱۵۳ اور ڈاکٹر محمد حسین الذہبی کی کتاب، التفسیر والمفسرون، ص ۶۰-۶۲
- ۹۰- مقدمہ تفسیر المنار ص ۷-۱۰
- ۹۱- ایضاً ص ۱۰
- ۹۲- شیخ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۱۲۵-۱۲۷
- ۹۳- ایضاً ص ۱۳۸
- ۹۴- ایضاً ص ۱۳۹
- ۹۵- ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۴۹
- ۹۶- احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۲۵
- ۹۷- ایضاً ص ۳۲۹
- ۹۸- مقدمہ تفسیر المنار، ص ۲۲-۲۳
- ۹۹- ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۶۱
- ۱۰۰- محمد عبدہ، تفسیر سورہ والعصر، مطبعہ المنار مصر، طبع دوم، ۱۳۳۰ھ، ص ۲۳-۲۴
- ۱۰۱- محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۲۹-۳۰
- ۱۰۲- ایضاً ص ۱۲۳

- ۱۰۳ ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ، لمحات فی علوم القرآن، ص ۳۱۹
- ۱۰۴ ڈاکٹر عثمان امین، رائد الفکر المصری، ص ۱۶۱
- ۱۰۵ احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، ص ۳۳۰
- ۱۰۶ اس پر تبصرہ کے لئے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر محمد حسین الذہبی کی کتاب "التفسیر والمفسرون" ص ۵۷۷-۵۷۲
- ۱۰۷ محمد عبدہ، تفسیر جزء عم، ص ۳۹
- ۱۰۸ ایضاً ص ۱۱۹-۱۲۰
- ۱۰۹ سید رشید رضا، تفسیر المنار، جلد اول، ص ۱۷۶-۱۷۷
- ۱۱۰ ایضاً ص ۲۶۷-۲۷۰

تفسیر فی ظلال القرآن - ایک تجزیاتی مطالعہ

سید قطب شہید دور حاضر کے ایک عظیم اسلامی مفکر تھے۔ فکر اسلامی کی تشریح و ترجمانی میں ان کا بہت ہی نمایاں حصہ ہے۔ انہوں نے دنیا کی اسلامی تحریکات پر عموماً اور عالم عرب پر خصوصاً غیر معمولی اثرات ڈالے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت مصر کے عام رواج کے مطابق جدید تعلیمی اداروں میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے مصر کی جدید دانش گاہ "دارالعلوم" میں داخلہ لیا۔ وہاں سے بی اے کی سند کے حصول کے بعد کچھ دنوں سرکاری ملازمت سے منسلک رہے۔ دریں اثنا مصری حکومت کی طرف سے جدید تعلیمی افکار و نظریات کے مطالعہ کے لیے انہیں امریکا جانے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کی پیش کش کی گئی جسے انہوں نے قبول کیا اور اس سے اپنی علمی استعداد میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کی زندگی کا ایک حصہ مصر کے عام مفکرین، ادباء اور ناقدین کی طرح ادبی اور تنقیدی موضوعات کے مطالعہ میں صرف ہوا۔ اس دور میں انہوں نے قرآن کریم پر ادبی اور فنی زاویہ سے نگاہ ڈالی اور اپنے مطالعہ کے نتائج "التصویر اللفظی فی القرآن" اور "مشاہد القیامۃ فی القرآن" نامی کتابوں کے ذریعہ پیش کیے۔ یہ کتابیں مصر اور عالم عرب کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ خود مصنف کی شخصیت پر ان کا بہت خوشگوار اثر مرتب ہوا اور ان کی اسلام سے عقلی اور جذباتی وابستگی میں اضافہ ہوا۔

اس دوران ادب اور تنقید سے متعلق ان کی کئی اہم نگارشات منظر عام پر آئیں۔ شعر و شاعری اور صحافت کی دنیا سے بھی انہیں بے حد دلچسپی تھی، جس کا ثبوت ان کے شائع شدہ تین شعری مجموعے اور مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے مقالات اور مضامین

ہیں۔ بعد میں وہ ایک معروف مجلہ کے مدیر بھی بنائے گئے اور خود اپنے وسائل سے ایک ماہ نامہ کی اشاعت کو ممکن بنایا۔

امریکہ سے واپسی کے بعد ان کی علمی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آیا اور ان کی توجہ ادبی اور تنقیدی امور و مسائل کے بجائے دینی، ملی اور تحریکی موضوعات کی طرف مرکوز ہو گئی اور وہ رفتہ رفتہ اپنے ملک کی معروف دینی جماعت ”الاکخوان المسلمون“ سے قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں وہ اس کے سرگرم رکن اور بعد میں اس کی مجلس عاملہ اور کئی دوسرے شعبہ جات اور کمیشنوں کے رکن اور ذمہ دار قرار پائے۔ ان کی بقیہ زندگی اسی تنظیم کے افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت اور اس کی سرگرمیوں میں عملاً شرکت کے لیے وقف ہو گئی۔ ان کی علمی، ادبی اور صحافتی استعداد و لیاقت پر اعتماد اور اعتبار کے باعث تحریک ”الاکخوان المسلمون“ نے انھیں اپنے ترجمان مجلہ ”المسلمون“ کا مدیر مقرر کیا لیکن ابھی اس مجلہ کی ادارت سنبھالے ہوئے صرف دو ماہ گزرے تھے کہ حکومت مصر نے ”الاکخوان المسلمون“ کو خلاف قانون قرار دے دیا اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیل کی تاریک کوٹھڑیوں میں قید کر دیا گیا۔ بعد میں ان میں سے بعض کو موت کی سزا دی گئی۔ مصر کی ایک عوامی عدالت نے سید قطب کو پندرہ سال قید با مشقت کی سزا کا مستحق قرار دیا۔ قید کے ابتدائی چند سال بہت مشقت میں گزرے لیکن بعد میں کچھ سہولیات دی گئیں خاص طور سے علمی مشاغل جاری رکھنے کے لیے ضروری ساز و سامان فراہم کیا گیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنی زندگی کی بڑی خواہش اور عظیم منصوبے یعنی اپنے مخصوص اسلوب اور نظریہ کے تحت قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا آغاز کر دیا۔ تقریباً دس سال کی سزا اور قید کے بعد ۱۹۶۳ء میں انھیں رہا کیا گیا لیکن ایک سال کے بعد انھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کا من گھڑت الزام لگایا گیا اور غیر مروجہ انداز اور غیر منصفانہ طریقے سے عدالتی کارروائی کر کے انھیں اور ان کے دو ساتھیوں کو موت کی سزا سنائی گئی۔ اور عالم اسلام کے شدید احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کی صبح سویرے اس سزا کو عملاً نافذ کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کے مطالعہ، اس پر غور و فکر اور اس کے اسالیب بیان کے فہم و ادراک کو اپنا وظیفہ حیات بنایا تھا۔ مذکورہ سطور میں قرآنیات سے متعلق دو اہم کتابیں ان کے اس سے انتہاک اور دلچسپی کی واضح مثالیں ہیں۔ ظاہر ہے یہ تصانیف اُس دور کی یادگار ہیں جب دینی موضوعات کی طرف ان کا رجحان بہت کم تھا۔ امریکہ سے واپسی اور ”الاخوان المسلمون“ سے تعلقات کی استواری کے بعد انھوں نے دینی اور اسلامی موضوعات پر تصنیف و تالیف کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنایا۔ اس کے نتیجے میں ان کی جو معرکہ الآراء تصانیف منظر عام پر آئیں ان میں بھی قرآن مجید سے استفادہ اور استشہاد کا عنصر غالب تھا۔ پھر جب دس سالہ قید با مشقت اور جیل کی تنہائیوں میں انھیں کچھ لکھنے پڑھنے کی سہولت فراہم کی گئی تو انھوں نے اسے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے زیر سایہ گزارنے اور امت مسلمہ اور ساری انسانیت کو اس کتاب سے قریب لانے اور اس سے حصول ہدایت کی طرف توجہ دلانے کے لیے وقف کر دیا۔ اور اپنے تاثرات و جذبات کو ”فی ظلال القرآن“ کے عنوان سے قلمبند کر کے مسلمانوں اور عام انسانوں کے سامنے ایک انتہائی قیمتی اور اشمول تحفہ پیش کیا۔

ان کی دیگر تصانیف میں ”معالم فی الطریق“، ”العدالة الاجتماعية فی الإسلام“، ”الإسلام ومشكلات الحضارة“، ”خصائص التصور الإسلامي“، ”معرکة الإسلام والرأسمالية“، ”الإسلام العالمي والإسلام“، ”دراسات إسلامية“، ”نحو التجمع الإسلامي“، ”کتب و شخصیات“، ”النقد الأدبی - اصول و منہج“، ”نقد کتاب مستقبل الثقافة فی مصر“، ”امریکا الٹی رائیہ“ اور ”مہمہ الشاعر فی الحیاة“ علمی حلقوں میں مقبول اور متداول ہیں۔ افسانوں، قصوں اور اشعار کے مجموعے اور دو اویں ان کے علاوہ ہیں۔ مذکورہ کتابوں میں سے کئی ایک اس اعتبار سے بے حد اہم ہیں کہ ان کے ذریعہ عصری اسلوب اور علمی زبان میں اسلامی نظام کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کی وضاحت اور تشریح کا انتہائی گراں قدر کام انجام پایا اور تحریک اسلامی کے مقصد، نصب العین اور طریقہ کار وغیرہ پر اطمینان بخش

اور مدلل رہنمائی فراہم ہوئی ہے۔ اسی بنا پر یہ کتابیں پوری اسلامی اور غیر اسلامی دنیا میں مقبول ہوئیں اور درجنوں زبانوں میں ان کے تراجم شائع ہوئے۔

تفسیر کا ایک عمومی تعارف

سید قطب کی سب سے معرکہ الآراء تصنیف قرآن مجید کی تفسیر ”فی ظلال القرآن“ ہے۔ یہ تفسیر ان کے قرآن مجید پر تیس سالہ غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ عالم اسلام میں اس کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ اس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہوئے۔ پوری دنیا میں اسلامی نظام حیات کے شیدائی اور اس کی اقامت اور احیاء کے لیے سرگرم اور سرگرداں مسلم دانشوروں اور علماء کے لیے یہ تفسیر دعوت و تحریک، تربیت و تزکیہ اور اصلاح و تغیر سے متعلق بے شمار گوشوں اور زاویوں کی توضیح و تفہیم کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ حالاں کہ اس کا بیش تر حصہ جیل کی پر مشقت اور پر آشوب قید کے دوران لکھا گیا، جہاں انھیں نہ تو مطلوبہ یکسوئی حاصل تھی اور نہ ہی وسائل و ذرائع۔ لیکن اس کی اثر انگیزی کے دائرہ کی وسعت اور ہمہ جہت مقبولیت اور پذیرائی کا اندازہ عالم اسلام کے ایک بالغ نظر ادیب کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے:

”بیسویں صدی میں عربی زبان میں کوئی تحریر اتنی جاندار اور زور دار نہیں

لکھی گئی جتنی سید قطب کی ”فی ظلال القرآن“ ہے۔ یہ کتاب زور بیان،

غیر معمولی زبان دانی اور خطابت کا شاہ کار ہے۔ ایسا نمونہ بیسویں صدی

کی کسی اور عربی تحریر میں نہیں ملتا۔ پڑھنے والا اس تفسیر میں ایسا بے خود

ہو کر بہتا چلا جاتا ہے کہ اسے کچھ خبر نہیں رہتی کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟“۔

یہ تفسیر کل چھ جلدوں پر مشتمل ہے (مطبوعہ دار الشروق، بیروت، ۱۹۷۹ء) اور یہ

مؤلف کے ان تاثرات اور احساسات کی آئینہ دار ہے جو قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران

ان پر طاری ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کے مقدمہ میں وضاحت کی ہے کہ وہ اس تفسیر

کے ذریعہ اپنے ان اچھوتے اور نادور خیالات اور گراں قدر ایمانی تصورات میں دوسروں کو

شریک کرنا چاہتے ہیں جو قرآن مجید کے زیر سایہ زندگی گزارنے کے دوران ان کے ذہن و دماغ میں وارد ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی ساری توجہ قرآن مجید کے پیغام، اس کے ادبی جمال، تصویری اسلوب بیان اور سیاق و سباق کی ندرت و جدت کی توضیح اور تقدیم پر مرکوز رکھی اور ہر اس بحث سے احتراز کیا جو مذکورہ مقاصد کے مغایر یا مخالف ہو۔ وہ اپنے تفسیری کام کا تعارف پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”قرآن کے سایہ میں زندگی گزارنا ایک ایسی نعمت ہے جس کی حقیقت صرف وہی پہچان سکتا ہے جس نے اس کا مزہ چکھا ہو، یہ ایک ایسی نعمت ہے جو زندگی کو رفعت، اس میں برکت اور اسے تزکیہ و تطہیر کی دولت سے ہم کنار کرتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے قرآن کے سایہ میں زندگی کا ایک لمبا وقت گزارا ہے۔ میں نے اس میں وہ لطف اور مزہ پایا ہے جو مجھے اپنی زندگی میں کبھی اور نہیں نہیں ملا۔“

سید قطب جدید مفسرین کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر اس انداز سے کی جانی چاہیے کہ اس سے اس کی اصل دعوت اور پیغام کی وضاحت ہو سکے اور وہ اپنے قارئین یا سامعین کو اسی طرح متاثر اور مرعوب کرے جیسے اس نے اپنے اولین مخاطبین کو متاثر کیا تھا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مفسر اپنے دور کے انسانوں کے علمی معیار اور ذہنی افق کو پیش نظر رکھتے ہوئے، عصری اسلوب میں قرآن مجید کی تفسیر اور توضیح کا کام کرے۔ اس طبقہ کو یقین ہے کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ و تراکیب کے معانی، ان کے عجائبات، اس کی زبان و بیان کی روح پرور تازگی اور اس کے لطیف ادبی محاسن کو لوگوں کے سامنے لایا جائے اور لغوی، نحوی، فقہی اور کلامی مباحث سے کلی طور سے اجتناب کیا جائے تو اس سے ان کے احساس و شعور اور قلب و ضمیر میں اصلاح احوال کی زبردست تحریک پیدا ہوگی اور وہ رشد و ہدایت کے مراحل باسانی طے کر سکیں گے۔ چنانچہ اس مکتب فکر کے وابستگان نے کسی مسلک یا نظریہ کے حصار میں محصور ہونے کے بجائے، قرآن مجید کی ادبی طرز تفسیر کی وکالت کی ہے۔ اس کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس

نے اسرائیلیات کو نقد و جرح کی کسوٹی پر پرکھا، کمزور اور موضوع احادیث کو ناقابل استشہاد تصور کیا اور قرآن پاک کی تفسیر میں صحیح احادیث پر اعتماد کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے قدیم علوم کی گنجلک اور پیچیدہ اصطلاحات کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے قرآن کے ایجاز اور اعجاز کے انکشاف، اس کے کائناتی اصولوں اور معاشرتی آداب کی وضاحت اور اس کی روشنی میں امت مسلمہ اور اقوام عالم کے مسائل حل کرنے پر اپنی توجہات مرکوز رکھیں۔ چونکہ اس مکتب سے وابستہ افراد کی معلومات بے حد وسیع تھیں، انھوں نے مشرقی علوم کے ساتھ مغربی اور سائنسی علوم سے بھی استفادہ کیا تھا اور وہ مومنانہ بصیرت اور فراست کی دولت گراں مایہ کے حامل اور امین تھے۔ اس لیے انھوں نے قرآن مجید کی ان آیات کی، جن کا تعلق کائنات اور انسان کی تخلیق اور ان کے اہم مظاہر سے ہے، ایسی دلنشین اور قابل فہم تعبیریں پیش کیں جن سے جدید مسلم تعلیم یافتہ طبقہ کی دین کی اساسیات اور مقتضیات کے حوالہ سے الجھنوں اور شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا اور قرآن کی حقانیت اور صداقت پر ان کے ایمان و یقین میں تازگی اور پختگی آئی۔ اس طبقہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کو دور حاضر کے انسانوں کے مسائل کا ایک کامیاب حل اور ان کی زندگی کے لیے ایک مکمل دستور العمل کے طور پر پیش کیا۔

ہم جب سید قطب کے اس عظیم شاہ کار اور لازوال علمی و دینی کارنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ جانفشانی اور محنت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مطمح نظر دنیا کی چند روزہ زندگی کے فوائد کے بجائے آخرت کی ابدی زندگی کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا حصول ہو اور جس کا اسلامی نظام حیات کے احیاء، اور اس کی اقامت سے اس حد تک ربط و تعلق اور عشق و محبت ہو کہ تختہ دار بھی اس کے قدم کو متزلزل نہ کر سکے اور جیل کے تکلیف دہ نامساعد حالات اس کے مطالعہ اور تالیف کے کام میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

تفسیر کے بعض امتیازی اوصاف

اس تفسیر کے نام ”فی ظلال القرآن“ سے اس کے امتیازی اوصاف کی نشان دہی

ہوتی ہے۔ مؤلف اس کے مقدمہ میں اس نام کے تعین کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میں نے ”فی ظلال القرآن“ کا نام بلا کسی تردد اور تکلف کے اختیار کیا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا میں پوری زندگی سامنا کرتا رہا اور اس کے مختلف مراحل میں میں اپنے اندر یہ خواہش پاتا رہا کہ میں قرآن کے زیر سایہ زندگی بسر کروں۔ وہاں مجھے وہ راحت ملتی تھی جو کہیں اور ممکن نہیں تھی۔ میں مختلف احوال اور کیفیات سے گزرتا تھا۔ کبھی آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہوتا تھا اور کبھی زمین پر مضبوطی سے کھڑا محسوس کرتا تھا۔ کبھی مجھ پر روشن اور ہوادار کھڑکیاں کھل جاتی تھیں اور کبھی کچھ اور“۔ ۵

اس تفسیر کے آغاز کے داستان بھی بڑی مختصر لیکن سبق آموز ہے۔ صاحب تفسیر کو ایک مصری ماہنامہ کی طرف سے مدعو کیا گیا کہ وہ اس کی ہر اشاعت میں کسی ایک موضوع پر مستقل لکھنے کا اہتمام کریں۔ انہوں نے یہ پیش کش قبول کرتے ہوئے اپنے کالم کا نام ”فی ظلال القرآن“ تجویز کیا۔ پھر ان کی اس موضوع سے دلچسپی برابر بڑھتی گئی اور مستقل تفسیر لکھنے کا داعیہ تیز تر ہوتا گیا۔ اس کے نتیجے میں یہ مہتمم بالشان تفسیر منصہ شہود پر آئی۔

”فی ظلال القرآن“ ذخیرہ تفاسیر میں اس لحاظ سے ایک منفرد اور ممتاز تفسیر ہے کہ اس میں اس دور کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں قرآن نازل ہوا تھا چنانچہ اس کی وہ آیات جن کا تعلق عقائد، عبادات، اخلاق، آداب اور احکام وغیرہ سے ہے ان کی ایسی دلنشین تشریح کی گئی ہے کہ پڑھنے والے پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ گویا قرآن اس سے براہ راست مخاطب ہے اور اس کے معانی اور اس کی ذات کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔

اس تفسیر کا یہ وصف بھی انتہائی قابل قدر ہے کہ اس میں عہد رسالت اور عصر حاضر کے مسائل اور معاملات کا تجزیہ کر کے دونوں کے درمیان اشتراک اور مماثلت کی بنیادیں تلاش کی گئی ہیں اور پھر آج کے مسلمانوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ وہ ان سے کیسے عہدہ برآ ہوں؟ ان کے اندر کس طرح کے اوصاف و خصائص کی موجودگی ناگزیر ہے؟ ان

سب امور پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ البقرہ میں بنی اسرائیل سے متعلق آیات کے آغاز میں انھوں نے تفصیل سے مدینہ میں یہودیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا تذکرہ کیا اور ان کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی ہے، پھر یہ بتایا کہ انھیں دنیا میں عالم اسلام کے علاوہ کہیں عزت و احترام اور سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوا، نہ ماضی میں اور نہ حال میں، دین اسلام چونکہ مذہبی اور نسلی عصبیتوں سے پاک اور صلح و آشتی اور عدل و مساوات کا داعی ہے اس لیے اس نے ہر کسی کے لیے اپنا دامن عفو و درگزر ہمیشہ پھیلائے رکھا اور اپنی ردا و حفظ و امان میں جگہ دی۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیت ”وان عدتم عدنا..... (۸)“ کے تحت انھوں نے بنی اسرائیل کے فساد فی الارض برپا کرنے کی عادت اور اللہ تعالیٰ کی مواخذہ کی سنت کا تذکرہ کرتے ہوئے دور حاضر میں ان پر ہٹلر کے مظالم اور یورپ سے اخراج کے واقعات کی طرف رہنمائی کی ہے اور پھر ان کے عالم عرب میں آباد ہونے اور عربوں کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کر کے مملکت اسرائیل کی داغ بیل ڈالنے کے دوران ان کے مظالم اور سفاکیوں کا حوالہ دے کر ان کے جلد ختم اور نیست و نابود کیے جانے کا ذکر کیا ہے، اور ایسا ان کی نظر میں اللہ کے قطعی وعدہ کی تصدیق اور اس کی غیر متغیر سنت کے باعث ہوگا۔

نظم کلام اور ربط آیات پر زور

سید قطب کا سورہ کی تفسیر لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے اس کی آیات کو مختلف حصوں اور مجموعوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (یہ عمل پچیسویں پارہ کے اختتام تک جاری رہا۔ بعد میں دو تین سورتوں کے علاوہ باقی تمام سورتوں کی آیات کو ایک ساتھ، یکجا نقل کر دیا ہے) پھر ہر حصہ کی آیات اپنے مخصوص انداز میں نقل کرتے ہیں یعنی ان آیات کے درمیان یا ان کے اختتام پر مختلف قسم کی علامتیں قائم کرتے ہیں، جن سے ان آیات کے مطالب کے سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ سورہ الحجرتک ان کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ آیات کے مجموعہ اول کے نقل کرنے سے پہلے ایک، انتہائی پر مغز اور موثر مقدمہ لکھتے

ہیں۔ بعد کی سورتوں میں یہی مقدمہ ان کی آیات کے پہلے مجموعہ یا حصہ کے بعد موجود ہے۔ ان مقدمات میں انہوں نے سورہ کے مرکزی موضوع، دوسرے موضوعات، سورہ کا مزاج، نزول کے وقت کا ماحول، سورہ کا اس سے پہلے اور بعد کی سورتوں سے ربط و تعلق اور کبھی کبھی کئی سورتوں کے موضوعات کی یکسانیت اور ہم آہنگی، ان کے اسلوب اور طرز بیان وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پھر اس مجموعہ کی آیات الگ الگ نقل کر کے ان کے مطالب اور مفاہیم کی وضاحت کی ہے۔ پھر اس کے بعد مضمون کی رعایت سے تقسیم شدہ دوسرے مجموعوں کی آیات نقل کیا ہے اور ہر مجموعہ کی آیات کا اس کے ماقبل و مابعد کی آیات سے ربط و تعلق پر تشفی بخش گفتگو کی ہے اور ہر مجموعہ کی انفرادی خصوصیات کی نشان دہی کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے ہر حصہ اور مجموعہ کے اندر شامل آیات کے باہمی ربط و تعلق پر پوری توجہ دی ہے۔ اس کی ایک مثال سورہ البقرہ میں بنی اسرائیل کی سرگزشت سے پہلے قصہ آدم کے تذکرہ کی حکمت و مصلحت کی وضاحت ہے ۹ اور سورہ ص میں قصہ داؤد کے درمیان تین آیات (۲۷ تا ۲۹) کے ماقبل و مابعد سے ربط و تعلق کے اثبات کی کامیاب کوشش ہے۔

مصنف کے مذکورہ طریقہ تفسیر کی وجہ سے قرآنی سورتوں کی موضوعاتی وحدت اور ان کی آیات کے درمیان اتصال و ارتباط کا بہت عمدگی سے اثبات ہوتا ہے اور ہر سورہ ایک اکائی اور وحدت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کا اندازہ سورہ البقرہ سے سورہ الرعد تک کی کسی سورہ کے مقدمہ یا سورہ الانبیاء اور سورہ سبا کی ابتدائی تمہیدی گفتگو کے مطالعہ سے باسانی کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ سورہ فاطر اور بعض دوسری سورتوں کے مقدمات میں مصنف کی یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ان کی موضوعاتی وحدت کے بہت واضح اور نمایاں ہونے کی بنا پر ان کی آیات کی مختلف مجموعوں اور حصوں میں تقسیم کا کام بہت مشکل نظر آیا اور اس میں انہیں بڑی دقت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۳ سورتوں کے مرکزی موضوع یا اس کے ذیلی و ضمنی موضوعات کی توضیح اور ان میں وحدت اور یکسانیت کے اثبات کی وجہ سے تفسیر فی ظلال القرآن کا مرتبہ اور مقام دیگر عربی تفسیر کے

درمیان بہت بلند اور ممتاز نظر آتا ہے۔ یہاں وضاحت اور نمونہ کے طور پر سورہ النساء کے ایک پیرا گراف کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

”قرآن مجید کی ہر سورہ کی اپنی مخصوص شخصیت، منفرد مزاج اور نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں اور اس کا ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے جسے اس سورہ کے تمام اجزاء استحکام بخشتے ہیں۔ مخصوص شخصیت کا یہ تقاضا ہے کہ ہر سورہ کے اندر وارد مضامین، ایک مخصوص نظام کے تحت، اس کے مرکزی موضوع سے جڑے اور متصل ہوں۔ اس شکل میں اس کی خصوصیات نمایاں ہوں گی اور اس کے جواہر نکھریں گے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک زندہ انسان، جو اپنی جنس کے تمام انسانوں سے بہت سی چیزوں میں اتحاد کے باوجود، اپنی ظاہری اور باطنی خصوصیات کی بنا پر الگ اور ممتاز ہوتا ہے۔“

انہوں نے ہر سورہ کی ابتدا میں یا اس کے پہلے مجموعہ آیات کے بعد جو تعارفی مقدمہ لکھا ہے وہ قرآن مجید کے اسرار و رموز اور مصالح اور مقاصد کو سمجھنے کے حوالہ سے بہت اہم ہیں۔ یہ اپنی جامعیت، ہمہ گیری، فصاحت اور بلاغت کی بنا پر قارئین کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتے ہیں اور ان کے ایمان میں اضافہ، روح میں تازگی اور اعضاء و جوارح میں حرکت و عمل کے لیے آمادگی پیدا کرتے ہیں۔

ان مقدمات کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان میں سورتوں کے نزول کے زمانہ اور ماحول پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا کہ داعی اعظم نے کس طرح قافلہ حق کو کامیابی و کامرانی کی منزلوں سے سرفراز کیا اور اس راہ میں انھیں کن کلفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور کس حکمت، تدبیر، صبر اور استقامت سے انہوں نے ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔ الغرض قرآن مجید کی تعلیمات اور سیرت نبوی کے دروس و اسباق کی روشنی میں انہوں نے عصر حاضر کے مسلمانوں اور اسلامی تحریکات کو اسلام کی دعوت، اس کے احیاء اور غلبہ کی ممکنہ شکلوں اور صورتوں سے آگاہ کیا اور ان مسائل اور چیلنجز کا اطمینان بخش جواب دیا جو انھیں اس راہ میں

درپیش تھے، ظاہر ہے یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا کیوں کہ وہ قرآن و سنت کو اپنا ہادی اور رہنما تسلیم کرتے تھے اور ان میں غور و فکر کے عادی تھے۔ اسی بنا پر وہ قرآنی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کے قابل ہو سکے۔

ان مقدمات کے یہ اوصاف تقریباً ہر سورہ کے آغاز میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ جس خاص اہتمام، زور بیان اور دلائل کے ساتھ قرآن مجید کی ابتدائی چھ طویل سورتوں اور ان کے علاوہ سورہ یونس، سورہ ہود، سورہ یوسف اور سورہ الانبیاء کی ابتداء میں موجود ہیں وہ قرآن مجید کے طالب علموں کی بہت سی الجھنوں کے ازالہ اور رفع کے لیے کافی ہیں۔

فی ظلال القرآن میں سورتوں کے مقدمات کے علاوہ ان کے اختتامیے بھی بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا مقصد سورہ کے بنیادی مضامین کا اعادہ اور استحضار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے ذریعہ کسی سورہ کے اہم نکات کی مزید تشریح مقصود ہوتی ہے۔ اس اختتامیہ کا ذکر سورہ کی تمہیدی گفتگو میں بھی ہوتا ہے اور اس کے اخیر میں بھی۔ ۱۵ اس کی بہت عمدہ مثال سورہ ”الرعد“ کی تفسیر ہے جس کا اختتامیہ دس صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۶ اسی طرح سورہ آل عمران کی آخری آیت (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اختتامیہ کے طور پر جو لکھا ہے وہ یہ ہے:

”پوری سہدہ صبر اور تقویٰ کے تذکرہ سے بھری ہے۔ یہ دونوں اوصاف الگ الگ بھی بیان کیے گئے ہیں اور یکجا بھی۔ اسی طرح اس سورہ میں مشقتوں کو برداشت کرنے، راہ خدا میں جہاد کرنے، سازشوں کا مقابلہ کرنے اور شکست خوردہ اور تھڑد لے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اب اس سورہ کا اختتام صبر، مصابروہ، مطالبہ اور تقویٰ اختیار کرنے کی

ہدایت پر ہوتا ہے۔ یہ سب سے مناسب اور بر محل خاتمہ ہے۔“

تفسیر کے مطالعہ سے اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ ربط آیات اور سیاق کلام

کی رعایت ان کے نزدیک فہم قرآن کی ایک اہم کلید ہے، انھوں نے اس کے ذریعہ آیات اور ان کے الفاظ کے تعین اور تشریح میں کافی مدد لی ہے۔ اور بعض مقامات پر ان مسائل اور امور میں اپنی واضح اور قطعی رائے دی ہے جن میں مفسرین کی رائیں مختلف تھیں۔ مثلاً انھوں نے سورہ ہود کی آیت ۱۲، ۱۷ اور ۱۱۴ کو کی ثابت کیا ہے جنہیں عام طور سے مدنی تصور کیا جا رہا ہے۔ ۱۸ یہی رائے انھوں نے سورہ یوسف کی ابتدائی چار آیات کے متعلق بھی دی ہے۔ انھوں نے دونوں جگہ یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں سورتوں کا مزاج، ماحول، موضوع اور سیاق و سباق ان آیات کے مدنی ہونے کی دلیل فراہم کرتا ہے۔ ۱۹

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید پر غور و فکر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی بصیرت اور ایسے اصول عطا کر دیے تھے جن سے وہ تفسیر کے دوران مدد لیا کرتے تھے۔ ان میں ایک اصول سیاق کلام اور تناسق آیات ہے، اس اصول کی رعایت کی بنا پر انھوں نے اپنی تفسیر میں بہت سی تفسیری اور اسرائیلی روایات کے مکمل نقل و تذکرہ سے گریز کیا ہے اور قرآن مجید کے مقاصد نزول وغیرہ کی روشن میں انتہائی ضروری نکات اخذ اور بیان کیے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ المائدہ آیت ۲۷ تا ۳۱ میں مذکور حضرت آدم کے دو بیٹوں سے متعلق ایک واقعہ کی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قرآنی سیاق، اس قصہ کے زمانہ، جگہ اور اسماء کی تعین نہیں کرتا ہے۔“

گرچہ روایات میں بعض تفصیلات ملتی ہیں لیکن ہم اس قصہ کے اجمال پر

قناعت کو ترجیح دیتے ہیں۔ قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے اس

کے مقصود کی وضاحت ہو جاتی ہے اور روایات میں مذکور تفصیلات سے

اس مقصود کی وضاحت میں کوئی مدد نہیں ملتی ہے۔“ ۲۰

سورتوں اور ان کی آیات کے درمیان ربط و تعلق کے اثبات اور ان کے موضوعات اور ان میں وحدت کی تشریح و توضیح کے لیے انھوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں سیاق، تناسق اور ان سے مشتق بعض الفاظ کے علاوہ جملہ، شوط، تعقیب، ختام، ربط، ارتباط، ایقاع، عرض، مشہد، جو، خلال، اطار اور مجال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

منفرد ادبی اسلوب کی شاہ کار

سید قطب عصر حاضر کے مشہور ادیب اور ناقد تھے۔ ان کی تفسیر میں ان کا ادبی اور تنقیدی ذوق بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے جدید ادبی انداز اور معیارات کے مطابق قرآن مجید کے ادبی حسن اور اعجاز کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ان کا یہ اختصاص ہے کہ انھوں نے ایک طرف فصیح و بلیغ عربی زبان میں قرآنی آیات کے اسالیب، ان کے محاسن اور ان میں موجود بلاغت اور اعجاز کے نادر گوشوں کی وضاحت کی ہے تو دوسری طرف قرآنی آیات اور الفاظ کے اندر موجود نغمگی، ترنم اور موسیقیت کو بھی نمایاں کیا ہے اور تیسری طرف قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات، دوزخ اور جنت کے مناظر، قیامت کے احوال اور دیگر حقائق کی پیش کش میں تصویر کشی اور منظر نگاری کے فنی عناصر کی موجودگی اور ان کے استعمال پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کائنات اور اس کی موجودات اور اشیاء میں جو حسن و جمال اور ذوق و وجدان کی تسکین کا جو سامان بکھرا پڑا ہے اور جس کی طرف قرآن مجید نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں انھوں نے ان سب کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے اور ان کی ایسی بلیغ تشریح کی ہے کہ اس سے ان کی رعنائی و شگفتگی اجاگر ہو جاتی ہے اور قارئین کے جمالیاتی ذوق کی تسکین و تسلی کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ اس طرح اس تفسیر میں مصنف کے اختیار کردہ اسلوب کو بجا طور سے ایک منفرد ادبی اسلوب قرار دیا گیا ہے۔ ادب اور تنقید میں اپنے ممتاز مقام و مرتبہ کے باعث وہ بلاشبہ اس کے مستحق تھے۔ ان کے تفسیری اسلوب کا ایک بڑا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ان علمی اصطلاحوں اور الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے جن سے دوسری تفاسیر بھری پڑی ہیں اور ان کے بالمقابل انھوں نے کچھ ایسے الفاظ اور اصطلاحات کا بکثرت استعمال کیا ہے جو ان کی ذات اور شخصیت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس کا ادراک ہر وہ شخص بہت آسانی سے کر لے گا جو ان کے طرز تحریر اور ان کی تصانیف سے واقف ہوگا۔

سید قطب کو قرآن مجید کے اسالیب اور ان کے فنی محاسن سے شغف اور دلچسپی

اُس وقت سے تھی جب وہ عمر کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بچپن میں قرآنی آیات کی تلاوت کے دوران وہ بعض مقامات پر ٹھہر کر اسلوب بیان کی جدت اور ندرت سے محظوظ ہوتے تھے اور خاص طور سے قرآن کریم کی تصویر کشی اور منظر نگاری سے متاثر اور مبہوت ہوتے تھے۔ ۲۱۔ یہ سلسلہ عمر کی ہر منزل میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں مجلہ ”المقتطف“ میں سلسلہ وار مضامین کے ذریعہ ان سے متعلق اپنے افکار و خیالات کو مرتب انداز میں پیش کرنے کی شروعات کی۔ ان مضامین میں وہ قرآن مجید کے مختلف مقامات سے ایسی آیات کا انتخاب کرتے تھے جن میں افراد یا اقوام کے احوال و واقعات بیان کیے گئے ہیں پھر وہ ان میں پوشیدہ فنی خوبیوں کو اجاگر کرتے تھے۔ ۲۲۔ جب ان مضامین کی معتد بہ تعداد منظر عام پر آگئی اور انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو انہوں نے ان کا مجموعہ ”التصویر الفنی فی القرآن“ کے نام سے شائع کر دیا۔ ۲۳۔ وہ قرآن میں منظر کشی یا تصویر کشی کے اسلوب کے بارے میں اپنی بنیادی فکر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قرآنی مناظر یا تصویری خاکے، اس کے دوسرے اجزاء سے الگ اور مختلف نہیں ہیں۔ یہ قرآن مجید کی تعبیر اور اظہار بیان کا ایک مسلمہ اصول ہے۔ قرآن مجید نے اپنی تمام اغراض و مقاصد میں اس سے کام لیا ہے۔ اس لیے گویا بحث چند خاکوں یا تصویروں سے پردہ کشی سے نہیں بلکہ مسلمہ اصولوں کی وضاحت سے ہے۔“ ۲۴۔

وہ ایک جگہ مزید وضاحت سے لکھتے ہیں:

”تصویر قرآن مجید کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور قرآنی مضامین کو ذہن نشیں کرانے کا ایک ذریعہ ہے۔ تصویر کے ذریعہ ذہن میں مخفی امور اور نفسانی حالات کو محسوس صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تصویر کے ذریعہ عام طور سے دیکھے جانے والے حوادث، انسانی اجسام اور طبائع کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ پھر سلیقہ سے کھینچی ہوئی

اس تصویر میں زندگی اور حرکت نمودار ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ایک وہنی چیز متشکل اور متحرک ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔“ ۲۵۔

سید قطب قرآن مجید کے اس اچھوتے اور موثر اسلوب کی اہمیت اور افادیت کے اس قدر قائل اور اس سے دوسروں کو روشناس کرانے کے لیے اس قدر بے چین تھے کہ جیل کی پر مشقت زندگی میں جب لکھنے پڑھنے کی معمولی سے سہولت فراہم کی گئی تو انھوں نے اسے اپنی دیرینہ آرزو کے مطابق قرآن سے متعلق اپنے خیالات اور تاثرات کی جمع و ترتیب اور تالیف کے لیے غنیمت سمجھا۔ چنانچہ یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی تفسیر ”فی ظلال القرآن“ ان کے نظریہ ”التصویر اللفنی فی القرآن“ کی تشریح و تعبیر ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنی پوری زندگی قرآن مجید کے فنی جمال کے مختلف گوشوں اور اس کی تعبیر اور تصویر کشی میں ارتباط اور مماثلت کے مختلف پہلوؤں کا انھوں نے جو ادراک کیا اور ان سے جس طرح متاثر ہوئے، ان کی تفسیر ان کے ان ہی ادراکات، تاثرات، احساسات اور نتائج فکر کی آئینہ دار اور عکاس ہے۔

وہ اسی بات کو ایک جگہ مزید وضاحت کے ساتھ اس طرح لکھتے ہیں:

”میں نے اپنے ان خیالات اور تاثرات کو اس کتاب معجز کے مطالعہ کے دوران اس کے فنی جمال کے تعلق سے میرے دل میں آئے، پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک قرآنی تعبیرات اور تصویر کشی میں باہم ربط و اتصال ہے۔ میں نے تفسیر کے ذریعہ اس نظریہ کی عملی تطبیق پیش کی ہے۔ یہ میری دلی آرزو تھی جو میرے دل میں اُس وقت سے انگڑائی لے رہی تھی جب میں نے اپنی کتاب ”التصویر اللفنی فی القرآن“ کی تکمیل کی تھی۔ اُس وقت میں نے اپنے اس خیال کو بہت صاف طور سے پیش کیا تھا کہ ”میرے نزدیک تصویر کشی قرآنی اسالیب میں ایک نمایاں اور بہتم بالشان اسلوب ہے اور اس کی حیثیت تفسیر قرآن کے اہم اصول اور کلید کی ہے۔“ گرچہ اُس کتاب کے مطالعہ سے میرے فکر اور نظریہ کی پوری

تشریح و تفصیل سامنے آجاتی ہے لیکن میری یہ خواہش پھر بھی باقی رہی کہ میں اس اصول اور نظریہ کے مطابق پورے قرآن کی تفسیر پیش کروں۔ یہ آرزو کبھی کمزور اور کبھی مضبوط ہوتی رہی یہاں تک کہ ”فی ظلال القرآن“

کی شکل میں اسے پوری کرنے کا موقع ملا۔ ۲۶۔

یوں تو پوری تفسیر کے تقریباً ہر صفحہ پر مذکورہ فکر اور نظریہ کے مطابق قرآنی الفاظ اور آیات کی تشریح اور تفسیر کے نمونے اور مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اس مقصد سے خاص طور سے سورہ الاعراف، سورہ الرعد اور سورہ فاطر کا مطالعہ کیا گیا تو بڑی اچھوتی، جاذب نظر اور پرکشش مثالیں (پیرا گرافس) موجود پائی گئیں۔ مصنف نے اپنی بات کہنے کے لیے بہت عمدہ اور صاف ستھری زبان اور اچھے الفاظ اور عمدہ تراکیب کا سہارا لیا ہے۔ ان سب کی وضاحت اور تشریح کے لیے کافی وقت اور کثیر صفحات مطلوب ہیں۔

جدید افکار و علوم سے استفادہ

عصر حاضر کی بیش تر تفاسیر، جدید عصری اور سائنسی علوم سے استفادہ یا عدم استفادہ کے باب میں افراط و تفریط کی شکار ہیں وہ یا تو سائنسی معلومات سے یکسر خالی ہیں یا ان کے تابع اور ان سے متاثر ہیں۔ فی ظلال القرآن کے مصنف کا یہ امتیاز ہے کہ ایک طرف وہ قرآن و سنت اور دینی علوم میں ورک اور گہری بصیرت رکھتے تھے اور دوسری طرف انھیں مغربی افکار و نظریات اور فلسفوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ مزید برآں مغرب میں قیام کر کے مغربی تہذیب کی کنہ و حقیقت کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا، اپنے علمی آفاق کی اس ہمہ گیری، وسعت اور جامعیت کی وجہ سے وہ مغربی علوم اور تہذیب کے نہ تو مکمل شیدائی اور عاشق تھے اور نہ ہی بے لچک ناقد اور بے انتہا متنفر تھے۔ وہ ان کے اچھے پہلوؤں کے قدرداں اور ان سے استفادہ کے داعی تھے اور ان کے مضراور منفی پہلوؤں سے گریزاں اور محترز تھے۔ ان کی تفسیر کے مطالعہ سے اس باب میں ان کے موقف کی موضوعیت اور اس میں اعتدال کا بے ساختہ اختراع کرنا پڑتا ہے۔ ۲۷۔ بلاشبہ ان کی یہ تفسیر

عصر حاضر کے ایک صاحب علم و بصیرت فرد کی مجتہدانہ مساعی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اس میں جگہ جگہ انہوں نے ان اشکالات اور سوالات کا تشفی بخش جواب دیا ہے جو جدید افکار و علوم کے فیض یافتگان کے ذہن و دماغ میں کتاب و سنت کے حوالہ سے اٹھتے اور پیدا ہوتے تھے۔ پوری تفسیر کے مطالعہ سے جہاں قرآن اور سائنس اور وحی الہی اور عقل انسانی کے مابین صحیح رشتہ اور تعلق کا اندازہ ہوتا ہے وہیں دونوں میں عدم موافقت یا تصادم کی صورت میں قرآنی تصریحات کی حقانیت و ارحمیت اور وحی الہی کے غلبہ و تفوق پر ایمان و یقین کے لیے مضبوط دلائل فراہم ہوتے ہیں۔

سائنس کی بنیاد انسانی عقل اور تجربہ پر ہے۔ سید قطب انسان کی عقل اور اس کی قوت مشاہدہ و تجربہ کی اہمیت کے قائل ہیں۔ یہ انسانوں کے لیے ان کے خالق کی طرف سے بہت بڑا تحفہ ہے۔ ان کے مطابق انسان اس کے ذریعہ کائنات کے اندر موجود پائیدار اصولوں اور قوانین میں سے بعض کا پتہ لگاتا ہے اور موجودات عالم کی طبیعت اور خواص کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر انہیں اپنی مختلف ضروریات کی تکمیل اور اپنی گونا گون ترقیات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود چونکہ انسانی عقل کی رسائی محدود ہے اور اس سے حاصل شدہ نتائج قطعی اور آخری نہیں ہوتے اس لیے محض عقل کے ذریعہ، وحی اور رسالت سے ثابت شدہ حقائق کو جانچنا اور پرکھنا، انتہائی نامناسب ہے۔ ۲۸

سید قطب نے اس بات پر بے حد زور دیا ہے کہ قرآن مجید میں جس جگہ بھی کائنات اور اس کے مظاہر اور موجودات کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعہ ان کے خالق اور اپنے مقام و مرتبہ کی معرفت حاصل کر لے اور رشد و ہدایت کے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائے۔ ظاہر ہے مشاہدہ اور احساس کے دائرہ میں آنے والے حقائق کے ذریعہ غیر مشاہد اور غیر مرئی حقائق تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ اس مضمون کو انہوں نے اپنی تفسیر میں بہت شرح و بسط سے بیان کیا ہے ان میں سورہ فاطر (آیت ۲۷/۲۸) ۲۹ اور سورہ آل عمران (آیت ۱۹۰/۱۹۱) ۳۰ کے حواشی بطور خاص لائق مطالعہ ہیں۔

جدید سائنسی معلومات سے استفادہ اور ان کے حوالہ کے دوران انھوں نے بار بار یہ وضاحت بھی کی ہے کہ قرآن مجید کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے بیانات اور تصریحات کا سائنس سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کا مقصد انسان کو رشد و ہدایت سے ہمکنار کرنا ہے۔ اس کے لیے اس نے جو دلائل و براہین فراہم کیے ہیں ان کا ایک حصہ کائنات اور اس کی اشیاء سے متعلق ہے۔ خالق کائنات نے اپنی مصلحتوں کے تحت اپنی کائنات کے جن حقائق سے آگاہ کیا وہ حتمی اور یقینی ہیں۔ ان کا جائزہ انسان کی عقلی اور فکری کاوشوں سے لینا، حد درجہ کی زیادتی اور ظلم ہے۔ اس ضمن میں ان کے خیال سے صحیح واقفیت کے لیے سورہ المؤمنوں کی ابتدائی آیات میں ان کے تفسیری نوٹس کا مطالعہ مناسب ہوگا۔ اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

”انسانی تخلیق کی یہ حقیقت ہمیں قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم ان کی تصدیق، جدید نظریات سے نہیں طلب کریں گے، یہ نظریات انسانی تخلیق کی مختلف کڑیوں کو ملانے کی کوشش کرتے ہیں، جو صحیح بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم قرآن کی بیان کردہ تفصیل پر ایمان لائیں۔ سائنسی نظریات کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آج ایک بات کو ثابت شدہ قرار دیتے ہیں اور کل خود ہی اس کی تردید کر دیتے ہیں“۔ ۱۳

جدید سائنسی معلومات سے استفادہ کی ایک بہترین مثال سورہ الاعراف کی آیت ۱۷۲ ہے۔ جس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے نسل انسانی کی بقا و ارتقا میں کارفرما موروثی اثرات کی اہمیت کو جدید سائنسی اکتشافات اور اعترافات کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ اس کی دوسری مثال سورہ فصلت آیت نمبر ۵۳ ہے، جس کی تفسیر میں انھوں نے بیسویں صدی میں علوم و فنون کی ترقیوں اور کائنات اور نفس انسانی کے بہت سے راز ہائے سر بستہ سے انسانوں کی واقفیت کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ (ارائۃ آیات) کی تکمیل قرار دیا۔ ۱۴

لیکن سائنس کی مفید معلومات سے استفادہ اور سائنسی ترقیوں کو سراہتے ہوئے انھوں نے سائنس کے نقائص اور مضمر پہلوؤں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے

میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ آج کا انسان اگر کائنات سے متعلق اپنی معلومات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قوت، حکمت اور طاقت کا اندازہ کرتا ہے اور ان سے اُس کا اپنے رب سے تعلق مضبوط اور پختہ ہوتا ہے تو یہ معلومات مستحسن اور مفید ہیں۔ لیکن آج کی سائنس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی بنیاد مادیت اور خدا فراموشی پر ہے اس لیے یہ انسانوں کے لعنت اور ان کی زندگی کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔ اس کے باعث ہر جگہ خوف و دہشت کا ماحول اور چہار جانب بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ ہے۔ ۳۳

اس اصول کی روشنی میں انھوں نے مغرب کی خدایزادہ تہذیب کی زیر سرپرستی قائم، مروجہ باطل افکار و نظریات کی پر زور تردید کی ہے۔ چنانچہ ڈارون کے نظریہ ارتقا، مارکس کے نظریہ تاریخ، سیکولرازم، سوشلزم، سرمایہ داری، مغربی طرز جمہوریت اور صہیونیت پر ان کی بہت سخت تنقیدیں ان کی تفسیر کے متعدد مقامات پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ جدید تہذیب اور علوم کے معماروں اور سرپرستوں کی امور غیب سے لا پرواہی اور عدم اعتنا پر وہ بہت زیادہ ناراض ہیں۔ انھوں نے زور دے کر لکھا ہے کہ ”یہ دور جدید کی بہت بہت بڑی جہالت ہے۔ انسانی فطرت اور انسانی علوم کی تاریخ دونوں اسے مسترد کرتے ہیں۔ یہ دراصل صہیونیوں کی سازش کا ایک حصہ ہے۔ یہ شریک انسانیت کی فطرت کے ہر اچھے وصف کو ختم کر دینے کے درپے ہیں۔“ ۳۴

انھوں نے بعض قدیم و جدید فلاسفہ کے اس خیال کو رد کیا ہے کہ ”پوری کائنات اور اس کے مظاہر انسان کے دشمن اور اس کی ترقی کے راہ میں حائل ہیں۔ اور انسان اپنی پسند اور ارادہ سے اس مخالفت کی بنا پر کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا ہے“ اس کے مقابلہ میں انھوں نے انسان کے بلند مقام، اس کی خلافت اور اس کے لیے کائنات کی تسخیر سے متعلق قرآنی تصریحات کی روشنی میں انتہائی معقول دلائل فراہم کیے ہیں۔ ۳۵

تفسیر کے ماخذ

بلاشبہ تفسیر ”فی ظلال القرآن“ دینی معلومات کے ساتھ بہت سے معاصر علوم اور

نظریات کا انسائیکلو پیڈیا ہے، اس کی وجہ اس کے مصنف کی دین اسلام کے بنیادی مآخذ - قرآن و سنت - پر گہری نظر، اقوال صحابہ و تابعین اور کتب تفسیر و حدیث کا بالاستیعاب مطالعہ، حضرت محمد کی رسالت سے قبل کے مذاہب، ادیان و نظریات اور شخصیات سے کامل واقفیت، تاریخ عالم، تاریخ عرب اور تاریخ اسلام پر پورا عبور اور جدید مغربی تہذیب اور اس کی پشت پر کارفرما نظریات اور علوم و افکار سے مکمل آگہی ہے۔ مذکورہ علمی و فکری ذخائر پر اعرصہ و راز تک غور و فکر اور مطالعہ و تحقیق کے نتیجہ میں ان کے ذہن و دماغ کی ایک مخصوص کیفیت اور ان کی پوری شخصیت کی ایک منفرد شناخت بن گئی تھی جو اجتهاد، تخلیق اور ابتکار سے عبارت تھی۔ ان کی یہ تفسیر ان کی ہمہ جہت علمی و فکری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ اس تفسیر میں بے شمار اور ان گنت ایسے مواقع اور مقامات ہیں جہاں مختلف موضوعات پر انہوں نے ایسی مفید اور قیمتی باتیں قلمبند کی ہیں جن کا مطالعہ کر کے عقیدہ، فکر، فلسفہ اور تمدن کے حوالہ سے بے شمار سوالات کا جواب اور اہم نکالات کا حل سامنے آجاتا ہے اور قاری کو سکون اور اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے اور دین اسلام کی صداقت اور حقانیت پر اس کے ایمان و یقین میں استحکام اور پختگی آتی ہے۔

یہاں اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس عظیم الشان اور مایہ ناز تفسیر کے ان مآخذ اور مصادر کا مختصر تعارف پیش کیا جائے جن کے باعث اس کی قدر و منزلت اور اہمیت و افادیت میں بیش از بیش اضافہ ہوا۔ اس مقصد کے تحت جب اس کا مطالعہ کیا گیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس کے مصنف کے افکار و خیالات کی تکوین و تشکیل میں جس کتاب نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ قرآن مجید ہے۔ اس کے بعد سنت نبوی ہے جس تک رسائی حدیث کے ان مجموعوں سے ممکن ہوئی جو محدثین کرام نے بڑی سعی و جہد کے بعد مرتب کیے تھے۔ پھر صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال اور قدیم علماء امت اور ائمہ دین کی وہ مصنفات ہیں جن کا ایک حصہ تفسیری کتب ہیں اور جن کے دیگر اجزاء میں سیرت، تاریخ، فقہ، کلام، اسرار دین و شریعت سے متعلق کتب آتی ہیں۔ سید قطب نے دین اسلام کے ان بنیادی مآخذ اور مصادر سے بھرپور استفادہ کے ساتھ قدیم

آسمانی اور غیر آسمانی مذاہب، ادیان اور افکار و نظریات کے مصادر کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور ان کا تنقیدی و تحلیلی جائزہ لیا تھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے دور حاضر کے مسلم علماء اور غیر مسلم مفکرین، دانش وروں اور سائنس دانوں کی تصانیف اور عصری (سماجی، سیاسی اور اقتصادی اور تہذیبی) افکار و نظریات کا انتہائی باریک بینی اور کھلے ذہن و دماغ سے مطالعہ کیا تھا۔

اس وسیع مطالعہ، طویل غور و فکر اور مجتہدانہ زاویہ نظر کی وجہ سے انھوں نے جہاں اپنی تفسیر میں حدیث کے تمام مجموعوں، بطور خاص بخاری، مسلم، مسند احمد اور سنن ابوداؤد سے بہ کثرت احادیث نقل کی ہیں وہیں مفسرین، مورخین اور سیرت نگاروں میں سے ابن ہشام، ابن اسحاق، ابن جریر، ابن کثیر، زبیری، قرطبی، ابن حزم، ابن قیم اور مقریزی رحمہم اللہ کی تصانیف یا ان کی روایات سے اپنی تفسیر کے بے شمار مقامات پر استفادہ کیا ہے اور ان سے طویل اقتباسات نقل کیے ہیں۔ انھوں نے دوسرے مذاہب اور ادیان کے ماخذ، خاص طور سے عہد نامہ قدیم و جدید (تورات اور انجیل)، اسی طرح قدیم یونانی، رومی، ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں اور ان کی پشت پر کارفرما افکار و نظریات کا تعارف پیش کرنے والے جدید و قدیم مصادر کی طرف مراجعت اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ جدید مصادر سے مراد وہ تحقیقات اور علمی و تصنیفی کاوشیں ہیں جو گزشتہ تین یا چار صدیوں کے دوران یورپ اور دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں انسانوں کے اس کرہ ارض پر وجود، ان کے نسلی، تہذیبی اور سماجی ارتقاء، ان کی تاریخ کے مد و جزر، زمین پر ان کی سلطنت اور حکمرانی کی اہم علامات اور نقوش کی تلاش و جستجو، ان تک رسائی اور ان کی پیش کش کے حوالہ سے ہوئی ہیں اور ان سب کے نتیجہ میں قدیم اقوام و ملل اور افراد و اشخاص کے تعلق سے ایسے حقائق اور انکشافات سامنے آئے جن سے گزشتہ زمانے کے لوگ ناواقف تھے۔ سید قطب ان تمام علمی تحقیقات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واقف تھے اور ان کا تذکرہ اپنی تفسیر کے مختلف مقامات پر کیا ہے۔ ۳۶

انھوں نے جدید زمانے کے جن مسلم علماء اور محققین کی تصانیف کا حوالہ دیا ہے

ان میں محمد عبده، رشید رضا، عبدالقادر عوده، محمد قطب، ابوزہرہ، عبدالقادر مغربی، ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ عزوجل وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے برصغیر کے مؤخر الذکر دونوں علماء کا تذکرہ اور ان سے استفادہ بہت احترام و اکرام کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ایک جگہ ”المسلم الصادق“ ۳۷ اور ایک دوسری جگہ ”المسلم العظیم“ ۳۸ کہا ہے اور ایک جگہ ان کی کتاب ”سود“ کے مباحث کو ”الجوت الدقیقۃ القیمۃ“ جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ۳۹ اسی طرح ایک مقام پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی کتاب ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ کو اپنے موضوع کی منفرد کتاب قرار دیا ہے۔ ۴۰ انہوں نے مغربی مفکرین اور سائنس دانوں کی تصانیف اور تحقیقات کا حوالہ اکثر و بیش تر قرآن مجید کی ان آیات کی تشریح و توضیح کے دوران دیا ہے جو کائنات، اس کے مظاہر، اس کی اشیاء، انسان کی تخلیق کے واقعہ، اس کے وجود کی حقیقت، اس کے مقام و مرتبہ، اس کے فرائض اور ذمہ داریوں وغیرہ سے بحث کرتی ہیں اور ان کی طرف انسانوں کو غور و فکر اور ان سے صحیح نتیجہ اور رہنمائی حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اسی طرح انہوں نے مغربی افکار و نظریات کا تذکرہ (جو کبھی کبھی استفادہ کی غرض سے کیا ہے اور اکثر و بیش تر نقد و جرح کے مقصد سے) ان آیات کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے جن میں دین اسلام کے بنیادی تصورات زیر بحث آئے ہیں۔ انہوں نے ان دینی تصورات مثلاً ایمان بالغیب، ایمان بالرسالہ، ایمان بالآخرہ، ہدایت بالقرآن، عبادت الہ واحد، وغیرہ کی انتہائی مضبوط دلائل، بھرپور جرأتِ ایمانی اور کامل عزم و یقین سے ترجمانی اور وکالت کی ہے اور ان کے بالمقابل مغربی تصورات مثلاً ہر قسم کی ہدایت کے لیے عقل انسانی پر انحصار، کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود اور اس کی رہنمائی کی ضرورت کا انکار، مادہ پرستی، اباحت پسندی، قوم پرستی، اشتراکیت، سرمایہ داری، صہیونیت، فرعونیت وغیرہ پر خوب جم کر تنقید کی ہے اور ان کے دلائل کے ضعف اور بے وزنی کو اجاگر کیا ہے۔ ۴۱ انہوں نے ان مغربی مفکرین اور ان کے نظریات کا تذکرہ کبھی ان کے نام کی صراحت کے ساتھ کیا ہے اور کبھی نام لیے بغیر ان کے افکار کو ان کی طرف منسوب کر کے۔ مثلاً ”اصحاب العلمیۃ المعاصرۃ“، اصحاب

الجبلیۃ الجدیدۃ، صاحب العلمیۃ الاشتراکیۃ، اہل الجبلیۃ الحاضرۃ، الجبلیۃ الجدیدۃ“ وغیرہ۔ ۴۲ تذکرہ کا یہی طریقہ انہوں نے بعض معاصر مسلم دانشوروں کے سلسلے میں بھی اختیار کیا ہے۔ خاص طور سے وہ اصحاب جو مغربی فکر و فلسفہ سے متاثر اور مشرق میں ان کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں اور فکر مند تھے۔ ان کا تذکرہ ان کے نظریات مثلاً وطنیت، شعبیت، عقلیت اور حریت وغیرہ کی نسبت کے ساتھ کیا ہے۔ ۴۳

مراجع اور مصادر کی یہ بحث، اس حقیقت کے اظہار کے بغیر ناقص رہے گی کہ اس تفسیر کے مصنف نے سب سے زیادہ اقتباسات اور حوالے، خود اپنی تفسیر اور اپنی کتابوں سے اخذ اور نقل کیے ہیں۔ سورتوں سے متعلق ابتدائی اور تمہیدی مباحث میں انہوں نے کثرت سے سابقہ سورتوں کے مباحث کا حوالہ اور ان کی طرف مراجعت کا مشورہ دیا ہے۔ اسی طرح مختلف الفاظ، آیات اور تراکیب کی تشریح و توضیح کے دوران بھی انہوں نے اپنی تفسیر کے ان مقامات کی نشان دہی کی ہے جہاں وہ ان سے قبل تفصیل سے گفتگو کر چکے ہوتے ہیں۔ تفسیر کے علاوہ مختلف موضوعات پر اپنی وقیح اور مدلل تصانیف سے بھی بہت کثرت سے اقتباسات پیش کیے ہیں اور جدید طرز کے مطابق ان کے حوالے دیے ہیں۔ ان میں سے ”التصویر اللفظی فی القرآن“، ”معالم فی الطریق“، ”مشاہد القیامۃ“، ”خصائص التصور الاسلامی“، ”ہذا الدین“ اور ”الإسلام ومشكلات الحضارة“ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا مآخذ و مصادر کی کثرت اور تنوع کی بنا پر ان میں سے ہر ایک کا تعارف اور ان سے استفادہ کی مقدار اور شکل و صورت کا تعین ایک مشکل اور طویل بحث و تحقیق کا متقاضی کام ہے اس کے لیے فرصت اور صلاحیت کے علاوہ کسی مجلہ کے محدود صفحات کی تنگ دامنی بھی ایک امر مانع ہے۔ اس لیے ان سب سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کی رعایت اور کارفرمائی کی بعض شکلوں اور صورتوں کی وضاحت پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن

سید قطب کی تفسیر کا سب سے اہم ماخذ خود قرآن مجید ہے۔ اس طرح اسے ”تفسیر القرآن بالقرآن“ کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے قرآنی الفاظ و آیات کے مفہیم و معانی کی تعیین و تشریح میں سب سے زیادہ انحصار و اعتماد قرآن مجید کے استعمالات اور نظائر پر کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے سورتوں کے اغراض و مقاصد، ان میں اور ان کی آیات میں باہمی ربط و تعلق، سیاق کلام اور اسالیب بیان کی وضاحت و صراحت کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اس کی سب سے بنیاد کتاب اللہ سے استفادہ کا یہی نظریہ اور موقف ہے۔ دین اسلام کے مختلف تصورات کی وضاحت، انسانیت کے مسائل کے تجزیہ، انسانی عقائد اور افکار کی تاریخ کے مطالعہ، جدید علمی و تہذیبی نظریات سے استفادہ یا ان پر تنقید وغیرہ میں بھی انھوں نے سب سے قطعی اور مستند دلائل کتاب اللہ سے فراہم کیے ہیں۔ قرآنی قصص اور ان کے اسالیب اور ان کے اغراض وغیرہ پر جو انھوں نے سیر حاصل گفتگو کی ہے اس کا بھی سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب ہے۔

قرآنی الفاظ کے معانی کی تعیین میں ان کے طریقہ کار سے واقفیت کے لیے درج ذیل مثالوں سے مدد ملتی ہے:

سورہ المائدہ آیت ۵۰ میں وارد لفظ جاہلیت کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”اس نص سے جاہلیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ جاہلیت، جیسا کہ اللہ تعالیٰ اور ان کی کتاب بیان کر رہے ہیں، انسان پر انسان کی حکمرانی کا نام ہے۔ کیوں کہ یہ انسان کے ذریعہ انسان کی بندگی کرنے، اللہ کی بندگی سے نکل جانے، اس کی الوہیت کا انکار کر دینے اور اس کے بالمقابل انسان کی عبادت اور الوہیت کے تسلیم کر لینے کی دعوت دیتی ہے۔“

اسی سورہ کی اگلی آیت ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى

اَوَّيْسَاء“ میں وارد لفظ ولی اور ولایت پر اپنی طویل بحث کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

”ولایت کا مطلب یہود و نصاریٰ کی مدد اور ان سے دوستی ہے۔ ان کے دین کی پیروی مراد نہیں ہے، کیوں کہ مسلمانوں سے یہودیت یا نصرانیت کی اتباع کی امید نہیں کی جاسکتی ہے، البتہ وہ ان سے دوستی اور ان کی مدد کے معاہدے کر سکتے تھے اور کیا تھا۔ اس سے انھیں منع کیا گیا ہے۔“ ۳۵

اسی طرح سورہ الاعراف کی آیت ۱۱ میں ”وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ وَصُورًا نَّامِكُمْ“ کی تشریح کرتے ہوئے پہلے خلق اور تصویر کا لفظی معنی بیان کیا ہے۔ پھر قرآن مجید کے دوسرے مقام کی ایک آیت ”الذی اعطی کل شیء خلقه ثم ہدی“ کی روشنی میں اس کی وضاحت اس طرح سے کی ہے:

”گویا اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے انسان کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اس کو انتہائی عمدہ صلاحیتوں سے نوازا ہے جن کی بدولت وہ دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز ہے۔“ ۳۶

سورہ والتین میں وارد دو الفاظ ”تین“ اور ”زیتون“ کے بارے میں احادیث اور تفسیری روایات میں جو تفصیلات موجود ہیں ان کا خلاصہ پیش کیا ہے پھر قرآن مجید میں لفظ زیتون کے دو اور جگہ استعمال ہونے اور تین کے کہیں اور استعمال نہ ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہم اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ قرآنی سورتوں کے انداز اور نظائر پر اعتماد کرتے ہوئے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ تین اور زیتون کے تذکرہ کا مقصد ان احکام کی طرف اشارہ اور ان یادوں کو تازہ کرانا مقصود ہے جو ان کے حوالہ سے دین اور ایمان سے وابستہ ہیں یا جن کا تعلق انسان کی بہترین ساخت پر خلقت سے ہے۔“ ۳۷

سورہ والنازعات کی ابتداء میں استعمال شدہ الفاظ ”نازعات“، ”ناشطات“،

”ساجات“ اور ”ساقات“ وغیرہ کے مفہوم و معنی کی مختصر وضاحت اور اس میں ضمن میں چند روایات کے تذکرہ کے بعد الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں اپنے اصل موقف کی تشریح اور تعارف اس طرح کراتے ہیں:

”ان الفاظ کا مدلول خواہ کچھ ہو یہ جس طرح قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں ان سے ہمارے احساس میں حرکت اور بیداری، شعور میں اضطراب اور براہِ سمجستگی اور ذہن و دماغ میں کسی خطرناک چیز سے تحفظ اور احتراز کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ الفاظ انسان کو پیش آنے والی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ اور تیار کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارا طریقہ کار یہ ہے کہ ہم قرآنی الفاظ کی لغوی تحقیق و تفتیش کو نظر انداز کرتے ہیں تاکہ ہم ان الفاظ اور جملوں کے مزاج اور طبعی تقاضوں کے تحت قرآن کے زیر سایہ زندگی بسر کر سکیں۔“ ۴۸

یہاں انہوں نے حضرت عمرؓ سے متعلق ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ وہ سورہ عبس کی تلاوت کے دوران اس کی آیت ”وفاکہتہ وابتا“ میں لفظ ”اب“ کے معنی کے فہم و ادراک کی خاطر کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئے لیکن فوراً تنبیہ ہوا اور اپنے کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ”کتاب اللہ میں جو واضح ہو جائے اس کی پیروی کرو اور جو واضح نہ ہو اُسے چھوڑ دو“۔ اس واقعہ سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ”اس سے کتاب اللہ کے الفاظ کے احترام کی ترغیب ملتی ہے۔ اسی طرح جیسے ایک غلام اپنے آقا کے الفاظ کا احترام کرتا ہے“۔ ۴۹

سورہ الحدید کی پہلی آیت: ”سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ میں تسبیح کے معنی و مفہوم کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی ان کی مذکورہ موقف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں، اس سلسلے میں ہمیں صرف قرآن کے ظاہری مدلول پر توجہ

دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد کافی ہے۔ وہی اس کائنات اور اس کی اشیاء کا خالق اور ان کے اوصاف اور خواص سے باخبر اور آگاہ ہے۔ ہمارا علم اس کے بالمقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ہم تسلیم کریں کہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کے اندر ایک خاص قسم کی روح ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے خالق اور مالک کی حمد و ثناء بیان کرتی ہیں۔ اسی خیال کی قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے تائید ہوتی ہے۔ (پھر آیات اور احادیث کا حوالہ ہے) ۵۰

قرآن مجید کے استعمالات اور نظائر کی روشنی میں اس کی کسی آیت یا مجموعہ آیات کی تشریح اور توضیح کی مثالیں تفسیر فی ظلال القرآن کے تقریباً ہر صفحہ پر موجود ہیں۔ اس کے اعتراف و تسلیم کے لیے سورہ فاتحہ کا مطالعہ کافی ہوگا جس کی تفسیر مختصر ہونے کے باوجود قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی آیات کے حوالوں سے مزین ہے اس کے علاوہ قرآن مجید کی ہر سورہ میں بعض آیات ایسی ہیں (طویل اور وسیط سورتوں میں ان کی تعداد زیادہ ہے) جن کے مضامین، مواد اور دلائل کو سامنے رکھ کر سید قطب نے بہت تفصیل سے اپنی آراء اور خیالات پیش کیے ہیں۔ اکثر و بیش تر یہ مباحث اپنی طوالت، زور بیان اور طرز استدلال کی بنا پر مستقل مضامین یا مقالات سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ ان مباحث میں حدیث، تفسیر، سیرت اور تاریخ کی مستند تصانیف اور کتابوں سے مراجعت کے علاوہ قدیم و جدید علماء، مفکرین اور فلاسفہ و حکماء کے افکار و خیالات سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے لیکن ان سب کے بالمقابل قرآن کریم سے اخذ و استفادہ اور اس کی آیات کا حوالہ اور ان سے استناد و استشہاد کا معاملہ سب سے غالب اور واضح ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور ان کے مفہم و معانی ان کے ذہن و دماغ میں راسخ، ان کی فکر و خیال میں پیوست اور ان کی زبان و قلم پر رواں دواں ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر چند آیات کا حوالہ دیا جا رہا ہے جن کے مطالعہ سے مذکورہ خیال کی تصدیق ہوگی۔

سورہ البقرہ آیت ۲۷۵ (الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ

الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ..... الخ) ۵۱ میں سود پر بحث، سورہ المائدہ آیت ۳۸ (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا..... الخ) میں جرائم سے متعلق قرآن کے احکام پر گفتگو، ۵۲ اسی سورہ کی آیات ۳۰ تا ۵۰ پر اللہ کی حاکمیت اور انسانوں کی اُس کے احکام و فرامین کی اتباع و تعمیل پر جامع اور تشفی بخش کلام، ۵۳ سورہ الاعراف آیت ۲۰۳ ”هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ“ میں قرآن مجید کی عظمت و اہمیت اور اس کے مقام کی وضاحت، ۵۴ سورہ الذاریات آیت ۲۱ ”وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ“ میں نفس انسانی کے خواص اور امتیازات کی تشریح، ۵۵ وغیرہ۔

قرآن مجید سے استفادہ اور استناد کی سب سے عمدہ مثالیں وہ مقدمات اور ابتدائے ہیں جو انہوں نے سورتوں کے آغاز میں تحریر فرمائے ہیں۔ ان میں سورتوں کے نام، زمانہ نزول، اسباب نزول وغیرہ کے علاوہ ان کے مرکزی موضوعات اور ان میں مذکور ہدایت ربانی کے نکات اور دعوت اسلامی کے مراحل کے علاوہ قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں کے خواص، ان میں یکسانیت اور مماثلت کے پہلوؤں اور متعلقہ سورتوں کے موضوعات اور مضامین پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ قرآنی سورتوں اور زیر غور سورہ کی آیات کا بار بار حوالہ اور تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ طویل اور اوسط سورتوں میں سے تقریباً تمام میں انہوں نے نہ صرف ماقبل و مابعد کی سورتوں اور ان کے مضامین کا تذکرہ کیا ہے بلکہ مکی اور مدنی سورتوں کے موضوعات کے امتیازات اور ان کے اسالیب وغیرہ کے تفردات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ۵۶ ان امتیازات اور تفردات کی نشان دہی کرتے ہوئے انہوں نے سورتوں کے ذاتی اوصاف، ان کے مزاج اور اس کی ساخت وغیرہ پر ایک ایسا پیرا گراف تحریر فرمایا ہے جس کا تفسیر کے مختلف مقامات پر اعادہ فرمایا ہے۔ اس کا عربی متن قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے:

”ومن ثم يلحظ من يعيش في ظلال القرآن ان لكل سورة من سورہ شخصية مميزة، شخصية لها روح يعيش معها القلب كما لو كان يعيش مع روح حي مديز الملامح والسمات

والانفاس، ولها موضوع رئيسي أو عدة موضوعات رئيسية
 مشدودة الى محور خاص ولها جو خاص يظل موضوعاتها
 كلها، ويجعل سياقها يتناول هذه الموضوعات من جوانب
 معينة، تحقق التناسق بينها وفق هذا الجو - ولها ايقاع
 موسيقى خاص - اذا تغير في ثنابا السياق فانما يتغير لمناسبة
 موضوعية خاصة وهذا طابع عام في سور القرآن جميعا ولا
 يشذ عن هذه القاعدة طوال السور كهذه السورة - ٥٤

انہوں نے قرآن مجید میں مذکور مختلف انبیاء، اشخاص اور اقوام کے واقعات اور
 قصص پر بحث کرتے ہوئے استفادہ بالقرآن اور تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کو
 پورے طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی تفسیر میں ان واقعات کا جہاں کہیں بھی تذکرہ ہوا ہے
 ان کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ ان واقعات کے نقل و تذکرہ اور تشریح و توضیح
 کے دوران انہوں نے چار اصولی باتیں ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھی ہیں۔

(۱) ان قصص و واقعات سے متعلق ان کی گفتگو ان کے سیاق و سباق اور نظم
 آیات کے مطابق رہے (۲) کسی ایک موقع پر ان کی جو تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں ان
 کے علاوہ اگر مزید تفصیلات کی ضرورت ہو تو قرآن کے ان مقامات سے رجوع کیا جائے
 جہاں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے (۳) ان سے متعلق تفسیر کی کتابوں میں مذکورہ روایات جن
 کا بڑا حصہ اسرائیلیات پر مشتمل ہے، سے بہت ناگزیر صورت حال میں استفادہ کیا جائے
 اور وہ استفادہ بھی انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ ہو (۴) ان سے متعلق کسی ایسی روایت کو
 قبول نہ کیا جائے جو قرآن مجید کی روح اور اس کے مقاصد اور شریعت کے اصول اور
 مسلمات سے متصادم یا متعارض ہو۔

مذکورہ بالا اصولوں کا فہم و ادراک ان کی تفسیر کے ان مقامات کے مطالعہ کے بعد
 ہوا جن میں حضرات انبیاء کرام یا ان کی اقوام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض انبیاء
 کی طرف اسرائیلی روایات کے حوالہ سے ایسی بے بنیاد اور بے سر و پایا باتیں منسوب کی گئی

ہیں جن سے ان کا تقدس و احترام، امانت و دیانت اور عزت و عصمت کی پامالی ہوئی ہے اور ان کی پوری شخصیت مجروح اور داغ دار ہوئی ہے۔ سوء اتفاق سے ان روایات کا ایک بڑا حصہ تفسیر کی کتابوں میں بھی نقل کر دیا گیا ہے اور ابن جریر طبری اور ابن کثیر جیسے مفسرین بھی ان سے احتراز اور اجتناب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حتیٰ کہ بعض روایتیں حدیث کے بعض مستند مجموعوں میں بھی شامل ہو گئی ہیں، ظاہر ہے ایسا ہمارے محدثین کرام کا روایت کے اصولوں پر زیادہ توجہ اور درایت کے اصولوں سے بے توجہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ان کے موقف کی وضاحت کے لیے سورہ الاعراف آیت ۱۳۵ ”فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الرِّجَازَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُمْ بِالْغَوَىٰ..... الخ“ کے تحت انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے ایک اقتباس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے:

”ان معجزات کے وقوع کے کیفیت اور شکل و صورت کے بارے میں ہمارے پاس کوئی قرآنی نص نہیں ہے اور نہ ہی نبی کریم سے اس سلسلے میں کوئی صحیح روایت منقول ہے۔ اس طرح کے مواقع پر ہم نے ہمیشہ اپنی تفسیر میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ہم قرآنی نصوص پر اعتماد اور اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے قرآن و سنت کی طرف مراجعت کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ضروری ہے تاکہ اسرائیلیات اور ان بے بنیاد اقوال اور روایات سے احتراز کیا جاسکے جو کتب تفسیر میں موجود ہیں۔ ان سے کوئی تفسیر مستثنیٰ نہیں ہے حتیٰ کہ ابن جریر طبری اور ابن کثیر کی تفسیر اپنی عظمت اور قدر و قیمت کے باوجود اس بڑی کمزوری سے محفوظ نہیں رہ سکی ہیں“۔ ۵۸

ان کے خیال اور نقطہ نظر کی مزید وضاحت اور تفسیر کے دوران اس کے عملی انطباق کی شکلوں سے واقفیت کے لیے درج ذیل آیات اور ان میں مذکور قصص و واقعات کا مطالعہ مفید ہوگا۔

سورہ البقرہ آیت ۳۰ تا ۳۷ (بنی اسرائیل سے متعلق متعدد واقعات) فی ظلال

القرآن ج ۱، ص ۶۳ تا ۸۰ / البقرہ آیت ۱۰۲، (حضرت سلیمان، جادو اور دو بادشاہ) تفسیر
 مذکور، ج ۱، ص ۹۵-۹۷ / سورہ آل عمران آیت ۳۳ تا ۶۳ (آل عمران، حضرت مریم،
 حضرت عیسیٰ) ج ۱، ص ۳۸۹-۴۰۷ / سورہ الاعراف آیت ۲۶ (حضرت آدم و حوا) ج ۳،
 ص ۱۲۷۸ / الاعراف آیت ۱۳۵ (الواح موسیٰ) ج ۳، ص ۱۳۷۰ / الاعراف آیت ۱۳۳
 (قوم بنی اسرائیل پر مختلف قسم کے عذاب) ج ۳، ص ۱۳۵۸-۱۳۵۹ / الاعراف آیت ۱۸۹
 (ایک آیت کے مدلول کا انطباق آدم و حوا پر) ج ۳، ص ۱۳۱۲ / الاعراف آیت ۱۷۵ (ایک
 آدمی کا واقعہ) ج ۳، ص ۱۳۹۷ / سورہ المائدہ آیت ۲۷ تا ۳۱ (حضرت آدم کے دو بیٹوں
 اور ان میں سے ایک کے ذریعہ دوسرے کا قتل) ج ۲، ص ۸۷۵ / سورہ ص آیت ۱۷
 (حضرت داؤد) ج ۵، ص ۳۰۱۷ / سورہ ص آیت ۲۱ تا ۲۴ (حضرت داؤد) ج ۵،
 ص ۳۰۱۸ / سورہ ص آیت ۳۱ تا ۳۴ (حضرت سلیمان) ج ۵، ص ۳۰۲۰ / سورہ ص آیت ۲۱
 (حضرت ایوب) ج ۵، ص ۳۰۱۲ / سورہ البروج، آیت ۴، (اصحاب الاخدود) ج ۶،
 ص ۳۸۷۲۔

حواشی و مراجع

- ۱ سید قطب، التصوير الفنی فی القرآن، دار الشروق، بیروت، ب ت، ص ۲۰۳
- ۲ سید قطب کی سوانح حیات اور تصنیفات سے واقفیت کے لیے ملاحظہ ہو:
- ☆ خیر الدین زرکلی، الاعلام، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۹۰ء، ۳/ ۱۳۷-۱۳۸
- ☆ محمد الصباغ، لمحات فی علوم القرآن، المکتب الاسلامی، بیروت، ب ت،
 ص ۱۶۸-۱۶۹
- ☆ خلیل حامدی، جادو و منزل، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳ تا ۵۹
- ☆ سید حامد علی، اردو ترجمہ تفسیر فی ظلال القرآن، جلد اول، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی،
 ۱۹۸۸ء، ص ۳۳ تا ۳۸
- ☆ محمد نجات اللہ صدیقی، اسلام کا نظام عدل، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی نئی دہلی،
 ۱۹۶۰ء، ص ۱ تا ۷

- ۳ محمود احمد غازی، محاضرات قرآنی، اریب پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۸
- ۴ سید قطب، فی ظلال القرآن، دار الشروق، بیروت، قاہرہ، ۱۹۷۹ء، ج ۱، ص ۱۱
- ۵ سید قطب، مقدمہ تفسیر ”فی ظلال القرآن“، دار احیاء الکتب العربیہ، طبع ثانی، ج ۱، ص ۵
- ۶ فی ظلال القرآن، دار الشروق، بیروت، قاہرہ، ۱۹۷۹ء، ج ۱، ص ۶۳-۶۴
- ۷ فی ظلال القرآن، ج ۴، ص ۲۲۱۴
- ۸ ملاحظہ ہو، مقدمہ تفسیر سورۃ النساء، ج ۱، ص ۵۵۳ تا ۵۷۱
- ۹ فی ظلال القرآن، ۱/۵۶
- ۱۰ فی ظلال القرآن، ۵/۳۰۱۹
- ۱۱ فی ظلال القرآن، ۴/۲۳۶۴-۲۳۶۷
- ۱۲ فی ظلال القرآن، ۵/۲۸۸۸-۲۸۹۱
- ۱۳ فی ظلال القرآن، ۵/۲۹۱۸
- ۱۴ فی ظلال القرآن، ۱/۵۵۵
- ۱۵ بطور نمونہ ملاحظہ ہو، تفسیر سورۃ البقرۃ، ۱/۳۵ اور ۳۳۹، ۳۴۰؛ تفسیر سورۃ الانبیاء، ج ۴، ص ۲۴۰۰، سورہ سبأ، ۵/۲۹۱۷
- ۱۶ فی ظلال القرآن، ۴/۲۰۶۶-۲۰۷۶
- ۱۷ فی ظلال القرآن، ۱/۵۵۱
- ۱۸ فی ظلال القرآن، ۴/۱۸۳۹-۱۸۴۰
- ۱۹ فی ظلال القرآن، ۴/۱۹۴۹-۱۹۵۰
- ۲۰ فی ظلال القرآن، ۲/۸۷۵
- ۲۱ سید قطب، التصوير الفنی فی القرآن، ص ۶-۷
- ۲۲ حوالہ مذکور، ص ۷
- ۲۳ پوری کتاب اوسط درجے کے ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی موضوع سے مشابہ ان کی ایک دوسری کتاب ”مشاہد القیامۃ فی القرآن“ ہے جو دار الشروق بیروت سے شائع ہوئی

ہے اور جو ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب کے مقدمہ میں پہلی کتاب کے کئی اقتباسات، خود مصنف نے نقل کیے ہیں۔

۲۳ سید قطب، التصویر الفنی فی القرآن، ص ۸

۲۵ حوالہ مذکور، ص ۳۲

۲۶ سید قطب، مقدمہ تفسیر فی ظلال القرآن، الجزء الاول، دار احیاء الکتب العربیہ، طبع دوم، ص ۶-۷

۲۷ اس موضوع پر تفسیر فی ظلال القرآن کے مقدمہ (طبع دار الشروق بیروت ۱۹۷۹ء) میں

بھی بہت عمدہ بحث کی ہے۔ ج اول، ص ۱۶-۱۸

۲۸ سید قطب، التصویر الفنی فی القرآن، ص ۲۰۷-۲۰۸

۲۹ فی ظلال القرآن، دار الشروق بیروت، ۱۹۷۹ء، ۲۹۳۲/۵-۲۹۳۳

۳۰ فی ظلال القرآن، ۱/۵۳۳-۵۳۶

۳۱ فی ظلال القرآن، ۲/۲۳۵۷-۲۳۵۸

۳۲ فی ظلال القرآن، ۵/۳۱۳۰

۳۳ فی ظلال القرآن، ۱/۵۳۵-۵۳۶

۳۴ فی ظلال القرآن، ۳/۱۳۸۷-۱۳۸۸

۳۵ مقدمہ تفسیر فی ظلال القرآن، دار الشروق بیروت، ۱۹۷۹ء، ۱/۱۶

۳۶ بطور مثال ملاحظہ ہو، سورہ الاعراف آیت ۱۷۲، فی ظلال القرآن، ۳/۱۳۹۲

۳۷ فی ظلال القرآن، ۳/۱۳۵۴

۳۸ فی ظلال القرآن، ۳/۱۳۲۵

۳۹ فی ظلال القرآن، ۱/۳۲۱

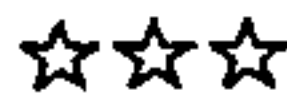
۴۰ فی ظلال القرآن، سورہ البینہ آیت نمبر ۱، ۶/۳۹۴۸

۴۱ بطور مثال ملاحظہ ہو سورہ الاعراف آیت ۱۰۴، ۳/۱۳۳۶ اور آیت ۱۳۰ تا ۱۳۷،

۳/۱۳۵۸-۱۳۵۶

۴۲ وضاحت کے لیے رجوع کریں سورہ المائدہ آیت ۲۱، ۲/۸۹۱، آیت ۵۰، ۲/۹۰۳-۹۰۵،

- آیت ۲، ۵۱/۹۰۹-۹۱۶
- ۴۳ بعض معاصر مسلم دانشوروں پر ان کی تنقید کے انداز سے واقفیت کے لیے ملاحظہ ہو، سورۃ
الغیل، آیت ۱، ۶/۳۹۷۸
- ۴۴ فی ظلال القرآن، ۲/۹۰۴
- ۴۵ فی ظلال القرآن، ۲/۹۰۹
- ۴۶ فی ظلال القرآن، ۳/۱۲۶۳
- ۴۷ فی ظلال القرآن، ۶/۳۹۳۳
- ۴۸ فی ظلال القرآن، ۶/۳۸۱۲
- ۴۹ حوالہ بالا
- ۵۰ فی ظلال القرآن، ۶/۳۳۷۷-۳۳۷۸
- ۵۱ فی ظلال القرآن، ۱/۳۱۸-۳۲۷
- ۵۲ فی ظلال القرآن، ۲/۸۸۲-۸۸۶
- ۵۳ فی ظلال القرآن، ۲/۲۸۷-۹۰۵
- ۵۴ فی ظلال القرآن، ۳/۱۳۲۱-۱۳۲۳
- ۵۵ فی ظلال القرآن، ۶/۳۳۷۹-۳۳۸۱
- ۵۶ اس طرح کے چند اہم مقدمات کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ البقرہ، ۱/۲۷-۳۵، آل عمران،
۱/۳۳۸-۳۵۹، المائدہ، ۲/۸۲۵-۸۳۳، الانعام، ۲/۱۰۰۴-۱۰۴۹، الاعراف،
۳/۱۲۳۳-۱۲۵۳، الانفال، ۳/۱۳۲۹-۱۳۶۹، التوبہ، ۳/۱۵۶۳-۱۵۸۳، یونس،
۳/۱۷۴۵-۱۷۵۵، حود، ۴/۱۸۳۹-۱۸۴۸، یوسف، ۴/۱۹۳۹-۱۹۶۸
- ۵۷ سورۃ البقرہ، ۱/۲۷-۲۸، دوسری سورتوں میں یہی عبارت معمولی فرق کے ساتھ دہرائی گئی
ہے: ملاحظہ ہو سورۃ الانعام، ۲/۱۰۱۵، سورۃ الاعراف، ۳/۱۳۳۳
- ۵۸ ایضاً، ۳/۱۳۵۸-۱۳۵۹



اسلامی فقہ پر علامہ ابن رشد کی شہرہ آفاق کتاب

بداية المجتهد ونهاية المقتصد

﴿ مجتہدین کی بنیادی اور طلبہ کی آخری کتاب ﴾

- دور قدیم میں طرز جدید پر لکھی جانے والی فقہ کی پہلی کتاب۔
- تمام مکاتب فکر کی آراء کو قرآن و سنت اور عقل عامہ سے استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔
- نہایت مختصر مگر پوری جامعیت کے ساتھ فقہی مسائل کے درج ذیل تمام پہلوؤں کو سمیٹتی ہے:

مسئلہ کی نوعیت — نصوص — استدلال — امت کا اجماع
فقہاء کے اختلافات و اتفاقات — نصوص کے معنوی احتمالات
نصوص کی صحت اور ضعف — اور ان پر صاحب تصنیف کا اپنا فیصلہ
اساتذہ و طلبہ اور عام قارئین کے لیے انمول کتاب

صفحات: 1240 مضبوط اور خوبصورت جلد قیمت: روپے

قرآن مجید کی تفسیریں

چودہ سو برس میں

(قرآنیات پر خدا بخش سیمینار میں پڑھے گئے مقالات)

مکتبہ قاسم علی

تاریخ ارض القرآن

سید سلیمان ندوی



مُسْتَشْرِقِينَ

أَوْ

انگریزی تراجم قرآن

پروفیسر عبدالرحیم قدوسی رضائے

ترجمہ

پروفیسر عبدالرحیم



ادارہ کی چند اہم مطبوعات

1300	ابن رشد مترجم ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	بداية المجتہد و نہایۃ المنتصد
460	مولانا عمر اسلم اصلاحی	قرآن مجید بحیثیت ماخذ سیرت
220	پروفیسر اختر اواسع	مستشرقین اور انگریزی تراجم قرآن
340	فیصل احمد ندوی	تفسیر اور اصول تفسیر
560	علامہ سید سلیمان ندوی	تاریخ ارض القرآن
560		قرآن مجید کی تفاسیریں چودہ سہ برس میں
360	پروفیسر محمد یسین منظہو صدیقی	شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی قرآنی خدمات
360	ڈاکٹر شکیل اوج	قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ
320	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	برصغیر میں مطالعہ قرآن
360	ترجمہ: ابو مسعود اظہر ندوی	اسلام یہ ہے (علامہ محمد غزالی)
560	عطر یف شہباز ندوی	محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے
350	ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی	سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کا جائزہ
1600	مولانا ضیا الدین اصلاحی	تذکرہ المحدثین (3 جلد)
480	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	اسلام اور جدید فکری مسائل
600	ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحق	جرح و تعدیل
747	ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحق	رہبر تخریج حدیث
6	ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحق	تاریخ تحفظ سنت اور خدمات محدثین
340	پروفیسر اختر اواسع	فقہ اسلامی (تعارف اور تاریخ)
360	شاہ معین الدین ندوی	دین رحمت
380	مولانا عبدالقدوس ہاشمی	مختصر تاریخ خلافت اسلامیہ
300	ڈاکٹر ساجد الرحمن صدیقی	اسلامی فقہ کے اصول مبادی
300	سید اعجاز حیدر	معلم لغة القرآن (نیا ایڈیشن)
340	مولانا حبیب الرحمن الازہری	تعدیل رجال بخاری
260	مولانا سلطان احمد اصلاحی	عصر حاضر کی نفسیاتی الجھنیں اور ان کا اسلامی حل